ھماری کتابیں .....

خُوبصورت، معیاری اور

کم قیمت کتابیں

تزئین واہتمام اشاعت

صفدر حسین

ضابطہ:۔

اشاعت دوم : 2012ء

مطبع : حاجی حنیف پرنٹرز لاہور

سرورق : ریاظ

قیمت : 600روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
شاخِ تنہا

شاخِ تنہا

خورشید رضوی

مجید امجد کے نام

اپنے جی میں جی، مگر اُس یاد سے غافل نہ جی
جو کسی کے دل میں زندہ ہے ترے دل کے لئے

مجید امجد

شعر کی دُھن مرے سینے میں بسائی ہے تو پھر
خون کو شعر کی رگ میں اتر آنا بھی سکھا

کب تلک، شمع صفت، بزم میں تنہا روؤں
خالقِ گریہ! اب اوروں کو رلانا بھی سکھا

ترتیب

پیش لفظ

شاعری کا ایک معمولی سا طالب علم بھی رومانی اور کلاسیکی مکاتبِ شعر کے فرق کو بخوبی سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کلاسیکی مکتبِ شعر سے منسلک شاعر کے ہاں روایت سے تعلق خاطر قوی، اور قواعد وضوابط کا احترام ایک مسلک کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے اخلاقی، جمالیاتی اور سیاسی عقائد کو تسلیم کرتا ہے اور شعری محاورے، تلمیح اور زبان کے رائج اور قابل فہم استعمال پر جان نچھاور کرتا ہے۔ بعدازاں جب وہ معاشرے اور اس کی روایات کا پوری طرح تابعِ مہمل بن جاتا۔ ہے تو اس کے کلام سے ''انفرادیت'' کی آخری رمق بھی خارج ہو جاتی ہے۔ اس سے شاعر کو یہ فائدہ تو ضرور پہنچتا ہے کہ سامعین، بالخصوص مشاعرے کے سامعین، اس کے کلام کو اپنا کلام سمجھ کر محظوظ ہونے لگتے ہیں۔ مگر نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں اس کا کلام اس کا اپنا کلام نہیں رہتا بلکہ ہر کسی کی ملکیت قرار پاتا ہے۔ دوسری طرف رومانی مکتبِ شعر سے منسلک شاعر کے ہاں شکست وریخت، آزادی اور آزادہ روی کا میلان زیادہ قوی ہوتا ہے۔ وہ انبوہ میں رہتا تو ہے مگر اس میں رہتے ہوئے خود کو سدا اکیلا محسوس کرتا ہے۔ کلاسیکی شاعر سوسائٹی کی پیداوار ہی نہیں اس کا علمبردار بھی ہے جب کہ رومانی شاعر اپنی ہی ذات کی گھمبیر تنہائی اور بے قراری کا سمبل ہے۔ شعری زبان کے سلسلے میں بھی وہ روایت سے روگردانی کرتے ہوئے ایک اپنی زبان خلق کرتا ہے۔ وہ پٹی ہوئی اور پامال قدروں سے منحرف ہو کر اپنے لئے ایک ایسا جہانِ تازہ وجود میں لاتا ہے جسے پرانی نسل مشکل ہی سے قبول کرتی ہے۔ مگر المیہ ملاحظہ کیجئے کہ رومانی شاعر جب اپنے مکان کو گراتا ہے تو خود اس کے ملبے کے نیچے دب جاتا ہے اور کلاسیکی شاعر جب اپنے مکان پر آرائشی سامان لاد کر اس کی کھڑکیاں اور

دروازے بند کر دیتا ہے تو اس میں قید ہو کر رہ جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں شاعری دم رکنے کی کیفیت میں مبتلا ہوتی ہے اور کبھی کبھی وجود میں آنے سے پہلے ہی راہیٔ ملکِ عدم ہو جاتی ہے۔ شاعر چاہے رومانی اندازِ فکر کا حامل ہو چاہے کلاسیکی رویے کا' اس کے ہاں عمدہ شاعری انہیں لمحات میں وارد ہوتی ہے جب وہ ان دونوں کے نقطۂ انضمام پر لحظہ بھر کے لئے آ کھڑا ہوتا ہے۔ یعنی جب اس کے ہاں معاشرتی قدروں کے احترام کے ساتھ ساتھ خول سے باہر آنے کی روش بھی وجود میں آتی ہے شاید اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ رومانیت مغز کی طرح ہے اور کلاسیکیت اس چھلکے کی طرح ہے جو اس مغز کو اپنی آغوش میں لئے ہوتا ہے۔ مگر جب تخلیق کا لمحہ آتا ہے تو مغز چھلکے کو توڑ کر باہر کو لپکتا ہے اور شگفتنِ ذات کا پیچیدہ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ چھلکے کے بغیر مغز کیلئے خود کو محفوظ رکھنا مشکل تھا اور مغز کے بغیر چھلکے کا قائم رہنا بے معنی۔ خورشید رضوی کے زیرِ نظر شعری مجموعے کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے بار بار یہ احساس ہوا کہ اس کے ہاں رومانی اور کلاسیکی دونوں رویوں نے قدم قدم پر ایک دوسرے سے مصافحہ کیا ہے جس کے نتیجے میں اس کے ہاں ایسا شعری مواد وجود میں آیا ہے جو کلاسیکی رکھ رکھاؤ سے عبارت بھی ہے اور رومانی لپک کا حامل بھی۔

ہر چند اردو کی کلاسیکی غزل اپنے ماحول سے پوری طرح جڑی ہوئی تھی لہٰذا اس نے اپنے شعری مواد کو معاشرے کے تمام ابعاد سے حاصل کیا ہے تاہم اس میں تلازمات کے پانچ سلسلے بہت نمایاں ہوئے۔ ان میں سے ایک سلسلہ چمن کے تلازمات پر مشتمل تھا اور گل و بلبل' دانہ و دام' صیاد' قفس' صبا اور بہار و خزاں کی زبان میں محبت کی داستان کو پیش کرتا تھا۔ دوسرا سلسلہ صحرا کے تلازمات سے عبارت تھا اور قیس و لیلیٰ' ناقہ' آہو وغیرہ الفاظ میں عشق کی واردات کو بیان کرتا تھا۔ تیسرا سلسلہ سمندر یا دریا کے تلازمات کا حامل تھا اور قطرہ' موج' ساحل' نہنگ' کشتی اور بادشرط کی زبان میں تصوف کے مدارج کا احاطہ کرتا تھا۔ چوتھا سلسلہ دربار یا بزمِ طرب سے اخذ کردہ تلازمات پر مشتمل تھا اور مے و مینا' شمع و پروانہ' رقیب' نامہ بر' فراق اور وصال کے کوائف کو پیش کرتا تھا اور پانچواں سلسلہ آلاتِ حرب سے متعلق تھا اور تیر' سناں' تلوار' ڈھال' زخم اور پھر اس ساری کارروائی کے نتیجے میں قتل' موت اور قبر کی باتیں کر کے معاشرے

کے جارحانہ رویوں کی عکاسی کرتا تھا۔ ان کے علاوہ کچھ اور سلسلے بھی تھے مگر میں یہاں اہم ترین سلسلوں کے ذکر پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ نئی اردو غزل جب اپنے رومانی طوفانوں کے زیر اثر آگے بڑھی تو اس نے اپنی پہلی ہی یلغار میں کلاسیکی غزل کے ان جملہ سلسلوں سے ایک بڑی حد تک منہ موڑ لیا اور یوں ایک ایسی فضا میں آ گئی جو تھی تو نئی اور تازہ مگر جو بہت سے نئے غزل گو شعراء کو راس نہ آئی۔ اس لئے کہ انہوں نے روایت سے خود کو غیر ضروری طور پر منقطع کر لیا تھا۔ خورشید رضوی کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ ہر چند وہ اپنے ردِ عمل کی نوعیت کے اعتبار سے نئی غزل کے علمبرداروں میں شامل ہے۔ تاہم اس نے کلاسیکی غزل کے سلسلوں سے منحرف ہونے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان سے وابستہ تلازمات کو بڑی خوبی سے اپنی شاعری میں برتا ہے۔ شاعری میں سب سے مشکل کام یہی ہے کہ نئی شراب کو پرانے آبگینوں میں پیش تو کیا جائے مگر اس طور کہ آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھل کر کچھ سے کچھ ہو جائے۔ بلکہ یوں محسوس ہو جیسے آج سے پہلے اس آبگینے کو استعمال میں لایا ہی نہیں گیا تھا۔

خورشید رضوی کے زیرِ نظر مجموعے میں کلاسیکیت اور رومانیت کا سنجوگ دکھائی دیتا ہے۔ وہ لفظ کو تراشنے اور سنوارنے کا گر جانتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے اشعار نگینوں کی طرح لو دیتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر صناعی کے عمل کے ساتھ ساتھ اس نے زاویۂ نگاہ کی تازگی کو بھی برقرار رکھا ہے اور پٹی ہوئی اور پامال شعری فضا سے باہر آنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ چند اشعار دیکھئے جو خورشید رضوی کی انفرادیت کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہیں :

آنکھ میچو گے تو کانوں سے گزُر آئے گا حسن
سیل کو دیوار و در سے واسطہ کوئی نہیں

کب نکلتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد
اس گلی کے دوسری جانب کوئی رستا نہیں

سب کے سب اپنے گریبانوں میں ہیں ڈوبے ہوئے
گُل سے گُل تک رشتۂ موجِ صبا کوئی نہیں

لبوں پر آج سرِبزم آ گئی تھی بات
مگر وہ تیری نگاہوں کی التجا کہ ''نہیں''

حیات و مرگ و طلوع و غروب ہے دنیا
کہ پر سمیٹتا ہے کوئی، تولتا ہے کوئی

مجھے یقین ہے کہ اہلِ نظر خورشید رضوی کے اس اوّلین مجموعۂ کلام کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ مجھے یہ بھی توقع ہے کہ خورشید رضوی کا شعری سفر اسی رفتار سے جاری رہے گا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے مضامینِ نو کے انبار لگاتا چلا جائے گا۔ رہا خرمن کے خوشہ چینیوں کا قصہ، تو اس سلسلے میں قحط الرجال کا۔ فی الحال اسے کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہئے۔

وزیر آغا

سخن ہائے گفتنی

اس کتاب کا انتساب جناب مجید امجد کے نام ان کی زندگی میں کیا گیا تھا۔ بڑی آرزو تھی کہ وہ اسے اپنی آنکھ سے دیکھتے۔ لیکن بسا اوقات غیور لوگوں کی تقدیریں بھی غیور ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس سے قبل کہ حکومت کی طرف سے مقرر کردہ وظیفے کی پہلی قسط انہیں وصول ہوتی، یا ایک عقیدت مند کی طرف سے معنون کی گئی کتاب ان کی نظر سے گزرتی، وہ اسی بے آہٹ خاموشی کے ساتھ رخصت ہو گئے جس بے آہٹ خاموشی کے ساتھ انہوں نے زندگی بسر کی تھی۔ عجیب المناک اتفاق ہے کہ جس روز اس انتساب کی کتابت ہو رہی تھی، (11 مئی 1974) عین اسی روز مجید امجد نے ان تمام یادوں سے غفلت اختیار کر لی جو دوسروں کے دلوں میں ان کے دل کیلئے زندہ و موجود تھیں امید ہے کہ یہ یادیں آئندہ بھی زندہ و موجود رہیں گی۔

رہی یہ کتاب، سو اس کی اشاعت کا مجھے ایک شوقِ فضول تھا تو سہی، مگر جرأتِ رندانہ کی حد تک کبھی نہ تھا۔ اور اگر مکرمی چودھری عبدالحمید صاحب اور محبی فاروق اختر نجیب صاحب کی طویل مسلسل پرخلوص اور پر اصرار تحریک نہ ہوتی تو شاید یہ سامان بعد مرنے کے ہی میرے گھر سے نکل سکتا۔ لہٰذا اگر اس مجموعے کے اشاعت میں خوبی کا کوئی پہلو نکلتا ہے تو اس پر تہنیت کے مستحق یہی دونوں حضرات ہیں۔ ان کے علاوہ محمد یٰسین، جمیل اختر، خالد محمود تبسم، عبدالرؤف، انور سدید، سجاد نقوی، جمیل یوسف، خالد اقبال یاسر، حسین احمد پراچہ، شاہد حسن، ارشد جاوید اور سید وزیر حسین شیرازی صاحبان کا شکریہ بھی لازم ہے جو کسی نہ کسی پہلو سے اس مجموعے کی ترتیب و اشاعت میں میرے معاون ہوئے۔

میں پروفیسر غلام جیلانی اصغر صاحب کا بھی ممنون ہوں جو میرے دوست ہونے کے

علاوہ میرے افسر بھی ہیں اور جنہوں نے افسری کے علی الرغم' مجھے چپ کی گپھا میں بخود خزیدہ اور مست رہنے کے مواقع فراخدلی سے بہم پہنچائے۔

آخر میں جناب ڈاکٹر وزیر آغا صاحب اور جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کی سپاس گزاری بھی مجھ پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے میری اس ناچیز کوشش پر اپنی قیمتی رائے کا اظہار فرمایا۔

خورشید رضوی

سرگودھا' 16 مئی 1974ء

مکرّر

''شاخِ تنہا'' کا نقشِ اول' پڑھنے والوں کی محبت کے سبب بہت جلد ختم ہو گیا تھا۔ اسبابِ ظاہری پر نظر کرتے ہوئے نقشِ ثانی کے امکانات بہت کم تھے۔ 1974ء میں اس کتاب کا اولین مسودہ عزیزم عبدالروؤف کی مساعی سے مرتب ہوا تھا۔ انہی کی محبت اس بار تکرارِ تمنا کا باعث بنی۔ چنانچہ یہ بھولی بسری نوا آپ اپنی بازگشت بن کر ایک بار پھر آپ کی سماعت پر دستک دے رہی ہے۔ امید ہے التفاتِ دلِ دوستاں سے محروم نہ رہے گی۔ محترم توصیف تبسم صاحب نے مفید مشوروں سے نوازا۔ برادرم خالد یوسفی صاحب نے قلم و موقلم سے تعاون فرمایا میں ان کا سپاس گزار ہوں۔

خورشید رضوی

مزید

''شاخِ تنہا'' کی تیسری اشاعت بھی اب ایک عرصے سے دستیاب نہیں اہلِ ذوق کی طلب نے تحریک مہیّا کی اور برادرم صفدر حسین کی محبت نے چوتھی بار اِس کا نقش اُبھارا۔ میں تہ دل سے اُن کا سپاس گزار ہوں۔

گزشتہ اشاعتوں میں برادرِ عزیز عبدالرؤوف کی مساعی نمایاں رہیں۔ افسوس کہ اس اشاعت کے وقت دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دیں۔ آمین

خورشید رضوی

○

کانٹوں سے بھرے بن میں رستے کی بنا ڈالی
دے دے کے لہو طرحِ نقشِ کفِ پا ڈالی

بدلے میں دفینے کے قطرے ہیں پسینے کے
کیوں دل کی گواہی پر دیوار گرا ڈالی

پھر آج فضاؤں کو مطلوب ہے خوں ریزی
بادل کی زرہ پہنی، شمشیرِ صبا ڈالی

دو حرف تسلّی کے جس نے بھی کہے اُس کو
افسانہ سنا ڈالا، تصویر دکھا ڈالی

دنیا رہی خوابیدہ، خورشید نے شب بھر میں
پچھّم سے شفق لا کر پورب میں بچھا ڈالی

○

میں سوچتا تھا کہ وہ زخم بھر گیا کہ نہیں
کھلا دریچہ، در آئی صبا، کہا کہ نہیں

ہوا کا رُخ تو اُسی بام و در کی جانب ہے
پہنچ رہی ہے وہاں تک مری صدا کہ نہیں

زباں پہ کچھ نہ سہی سن کے میرا حالِ تباہ
ترے ضمیر میں اُبھری کوئی دعا کہ نہیں

لبوں پہ آج سرِ بزم آ گئی تھی بات
مگر وہ تیری نگاہوں کی التجا کہ "نہیں"

خود اپنا حال سناتے حجاب آتا ہے
ہے بزم میں کوئی دیرینہ آشنا کہ نہیں

ابھی کچھ اس سے بھی نازک مقام آئیں گے
کروں میں پھر سے کہانی کی ابتدا کہ نہیں

پڑو نہ عشق میں خورشید ہم نہ کہتے تھے
تمہیں بتاؤ کہ جی کا زیاں ہوا کہ نہیں

○

گو نظر اکثر وہ حُسنِ لازوال آ جائے گا
راہ میں لیکن سرابِ ماہ وسال آ جائے گا

یا شکن آلود ہو جائے گی منظر کی جبیں
یا ہماری آنکھ کے شیشے میں بال آ جائے گا

ریت پر صورت گری کرتی ہے کیا بادِ جنوب
کوئی دم میں موجۂ بادِ شمال آ جائے گا

دوستو! میری طبیعت کا بھروسہ کچھ نہیں
ہنستے ہنستے آنکھ میں رنگِ ملال آ جائے گا

جانے کس دن ہاتھ سے رکھ دوں گا دنیا کی زمام
جانے کس دن ترکِ دنیا کا خیال آ جائے گا

حادثہ یہ ہے کہ ساری ذلّتوں کے باوجود
رفتہ رفتہ زخم سوئے اندمال آ جائے گا

○

تہِ دل میں نہ رہا، بامِ حسیں پر نہ رہا
اب وہ مہتابِ دل افروز کہیں پر نہ رہا

دل میں اندوہِ جدائی ہے نہ شوقِ دیدار
عمر گزری کہ کوئی نقش نگیں پر نہ رہا

جانے کیا کہہ کے سرِ شام ستارہ گزرا
رات بھر پائے دلِ زار زمیں پر نہ رہا

آ کے اڑتا ہے کہاں ناخنِ تدبیر کا رنگ
جب اُدھر داغِ مقدّر بھی جبیں پر نہ رہا

جیسے افلاک پہ بادل کا گزر تک بھی نہ ہو
اب کہیں رنگِ طرب طبعِ حزیں پر نہ رہا

○

یہ جام و بادہ و مینا تو سب دلاسے ہیں
لبوں کو دیکھ، وہی عمر بھر کے پیاسے ہیں

کرو جو یاد تو ہم سے بھی نسبتیں ہیں تمہیں
وہ نسبتیں جو کفِ پا کو نقشِ پا سے ہیں

ذرا میں زخم لگائے ذرا میں دے مرہم
بڑے عجیب روابط مرے صبا سے ہیں

ترے بغیر بھی کٹتی رہی، ذرا نہ رکی
شکایتیں مجھے عمرِ گریز پا سے ہیں

نہ بہہ سکیں تو رگوں میں رواں دواں نشتر
نکل بہیں تو یہ آنسو ذرا ذرا سے ہیں

○

رمز یہ کُھل جائے تو دنیا میں دل پھر کیا لگے
پاس سے دیکھیں تو مٹّی، دور سے دریا لگے

دل میں یوں اترا کسی کی ساعدِ سیمیں کا دھیان
شاخِ گُل جس طرح دیوارِ قفس سے آ لگے

کُھل رہی ہے گوشہ گوشہ مجھ پہ چشمِ التفات
وہ یہیں پتھر کا ہو جائے تو کیا اچھا لگے

خون رو دیتی ہے ہر موجِ صبا کے سامنے
دیکھنے میں آنکھ اپنی لاکھ بے پروا لگے

کٹ گیا دورِ خزاں فصلِ بہار آ بھی گئی
دیکھتے ہیں اب ہمیں کس بات کا دھڑکا لگے

○

یہی ہے عشق کہ سر دو، مگر دہائی نہ دو
وفورِ جذب سے ٹوٹو، مگر سنائی نہ دو

زمیں سے ایک تعلق ہے ناگزیر مگر
جو ہو سکے تو اسے رنگِ آشنائی نہ دو

یہ دور وہ ہے کہ بیٹھے رہو چراغ تلے
سبھی کو بزم میں دیکھو مگر دکھائی نہ دو

شہنشہی بھی جو دل کے عوض ملے تو نہ لو
فرازِ کوہ کے بدلے بھی یہ ترائی نہ دو

جوابِ تہمتِ اہلِ زمانہ میں خورشیدؔ
یہی بہت ہے کہ لب سی رکھو صفائی نہ دو

○

دیکھتا ہوں پھول اور کانٹے بہر سو آج بھی
یاد کرتا ہوں تری خوشبو، تری خو آج بھی

جانے کیوں جلتی سلگتی شام کے ایوان میں
پھیل جاتی ہے تری باتوں کی خوشبو آج بھی

زیست کے خستہ شکستہ، گنبدوں میں گاہ گاہ
گونجتا ہے تیری آوازوں کا جادو آج بھی

زلف کب کی آتشِ ایام سے کُمھلا گئی
زلف کا سایہ نہیں ڈھلتا سرِ مو آج بھی

تو نے اپنے ہاتھ سے جس پر لکھا تھا میرا نام
وہ صنوبر لہلہاتا ہے لبِ جو آج بھی

وہ ترا پل بھر کو ملنا پھر بچھڑنے کے لئے
دل کی مٹھی میں ہے اُس لمحے کا جگنو آج بھی

مدتیں گزریں مگر اے دوست تیرے نام پر
ڈول جاتی ہے مرے دل کی ترازو آج بھی

○

گلستاں میں زخمِ الفت سے کوئی خالی نہ تھا
خوشبوؤں کے تیر تھے، بادِ صبا کا سینہ تھا

مجھ کو اپنی ذات کے ٹکڑے نظر آتے رہے
انجمن میں جو بھی تھا ٹوٹا ہوا آئینہ تھا

اب تو اک مدّت سے اس کی دید بھی باقی نہیں
وہ حسیں منظر کہ جس کو دیکھنا کافی نہ تھا

صحبتِ ناجنس میں لے کر پھریں جنسِ گراں
اہل دل کا روزِ اوّل سے یہی روزینہ تھا

لٹ گیا سو بار لب تک آتے آتے ہر سخن
ورنہ جب دل سے چلا تھا اک عجب گنجینہ تھا

○

پھر آج اپنے گریباں میں غوطہ زن ہو لیں
پڑی ہیں جو تہِ دل میں وہ سیپیاں کھولیں

کسی کو دھیان میں لا کر کہیں کچھ ایسی بات
کہ آس پاس کے سب سامعے گھر رولیں

وہ ایک پل، وہ ترے لب سے ایک میٹھا بول
پھر آج تلخیٔ ایام میں اسے گھولیں

میں اُس مکاں میں ہوں جس میں پکاریے تو کہیں
کوئی جواب نہ دے اور بام و در بولیں

سفر نصیب ہیں ہم، ہم کو منزلوں سے کیا
یہی بہت جو کجاوے کی ٹیک سے سو لیں

تو اُن کی چشم و نگہ پر تو کان دھر کے دیکھ
جو اپنی کشتِ زباں میں خموشیاں بو لیں

○

خشک پتلی سے کوئی صورت نہ ٹھہرائی گئی
آنکھ سے آنسو گئے میری، کہ بینائی گئی

صبح دم کیا ڈھونڈتے ہو شب رووں کے نقشِ پا
جب سے اب تک بارہا موجِ صبا آئی گئی

رو رہا ہوں ہر پرانی چیز کو پہچان کر
جانے کس کی روح میرے روپ میں لائی گئی

مطمئن ہو دیکھ کر تم رنگِ تصویرِ حیات
پھر وہ شاید وہ نہیں جو مجھ کو دکھلائی گئی

چلتے چلتے کان میں کس کی صدا آنے لگی
یوں لگا جیسے مری برسوں کی تنہائی گئی

ہم کہ اپنی راہ کا پتھر سمجھتے ہیں اِسے
ہم سے جانے کس لئے دنیا نہ ٹھکرائی گئی

○

دل میں وہ جا بسا، رگِ جاں کاٹتا ہوا
لو آج ہم نے آنکھ سے دیکھا، سنا ہوا

منزل ہے دور، اور کوئی ہم سفر نہیں
آئینہ ہے سو گردِ سفر میں اٹا ہوا

دل چل پڑے تو مصلحتیں دیکھتا نہیں
ریگِ رواں میں بھی ہے یہ لنگر اٹھا ہوا

پامال کر کے مجھ کو، چلا ڈھونڈنے مجھے
مفلس کے گھر میں ہوں میں خزانہ دبا ہوا

دل بستگی جہاں میں کسی سے بھی ہو، غلط
کچھ اور غم رہے گا اگر باوفا ہوا

اُس اِک ستوں کی کیفیتِ گومگو نہ پوچھ
ملبے کے ڈھیر میں ہو جو تنہا کھڑا ہوا

دل کے معاملوں میں زباں معتبر نہیں
ہے معتبر نظر سے نظر کا کہا ہوا

سر تیلیوں سے پھوڑ رہا ہے اسیر اور
دروازہ پشت پر ہے قفس کا کھلا ہوا

کشتی خدا پر چھوڑ کے رنگ اڑ گیا ہے کیوں
گویا خدا نہ ہوا، ناخدا ہوا

دل میں لہو نہ ہو تو گلو میں نوا کہاں
کیا کیا خیال زیرِ زباں ہے رکا ہوا

خورشید اب کہاں ہے، کسی کو پتا نہیں
گزرا تو تھا کسی کا پتا پوچھتا ہوا

○

سیلِ ماضی کو نشیبِ جاں میں بھرنے دیجیے
آج پھر احساس کو ڈھلنے سنورنے دیجیے

آنکھ مت جھپکائیے، تارِ نظر مت توڑیے
چاند کو دل کے سویدا تک اترنے دیجیے

ڈھونڈیے موجِ صبا میں ڈھل کے اُس کو ڈھونڈیے
قریہ قریہ، کو بکو، خود کو بکھرنے دیجیے

روکیے اشکوں کی گرتی چلمنوں کو روکیے
اِن دریچوں میں کوئی صورت ابھرنے دیجیے

سامنے ہے اُس کو آنکھوں میں بسالے جائیے
عمر بھر اِس ایک پل کو مت گزرنے دیجیے

○

جب کبھی سازِ سخن پر سوزِ دل گاؤں گا میں
پھوٹتے نغموں میں تجھ کو رو برو پاؤں گا میں

آج تک ڈھونڈا کسی کا گوشۂ دامن عبث
آج سے اپنے گریباں میں اتر جاؤں گا میں

میری صورت میری تنہائی کے آئینے میں دیکھ
انجمن کی گرد میں کس کو نظر آؤں گا میں

اُس غزل کی جان کو ذوقِ غزل فہمی نہیں
دل کے ٹکڑوں کی یہ مالا کس کو پہناؤں گا میں

انجمن در انجمن بکھروں گا دن کے ساتھ ساتھ
شام ہوگی، اپنے پیکر میں سمٹ آؤں گا میں

○

کہاں ہوں میں کہ مرا کوئی آشنا بھی نہیں
کسی کا ذکر تو کیا، گھر میں آئنہ بھی نہیں

رہے خموش تو ٹوٹا نہ رشتۂ اُمید
پکارتے تو خرابوں میں کوئی تھا بھی نہیں

تری صدا پہ تو صدیاں بھی لوٹ آتی ہیں
مجھے بُلا، میں کچھ ایسا شکستہ پا بھی نہیں

یہ اور بات کہ نقشِ قدم دکھائی نہ دیں
مگر وہ عرصۂ دل سے ابھی گیا بھی نہیں

اُس اعتراف سے رس گھل رہا ہے کانوں میں
وہ اعتراف جو اُس نے ابھی کیا بھی نہیں

جس ایک چیز سے تیرا فراق آساں ہے
وہ ایک چیز تری یاد کے سوا بھی نہیں

مرا بھرم ہیں تغافل شعاریاں تیری
تو پوچھ لے تو مرا کوئی مدّعا بھی نہیں

مصالحت بھی نہیں ہے سرشت میں اپنی
مگر کسی سے تصادم کا حوصلہ بھی نہیں

نہ جانے کب نہ رہیں ہم، ہمیں غنیمت جان
حیات و موت میں کچھ ایسا فاصلہ بھی نہیں

مآلِ کار قناعت ہے سو ابھی سے سہی
وگرنہ طولِ تمنا کی انتہا بھی نہیں

○

گئے دنوں کا جو اب سے موازنہ کیجئے
تو ایک خنجرِ نادیدہ دل پہ چلتا جائے

کہاں وہ محفلِ احباب نور سے جس کے
ہر ایک سایۂ احساسِ درد ڈھلتا جائے

سروں پہ جھوم کے شاخِ زمانہ ہو گلریز
تو ہم خلشِ خار کل پہ ٹلتا جائے

تبسّموں سے تبسّم کو راہ ملتی رہے
چراغ سے کوئی جیسے چراغ جلتا جائے

کہاں وہ نقشِ کفِ پا کہ صورتِ مہِ نو
قدم قدم پہ نیا پیرہن بدلتا جائے

چلے جو تارِ نظر اُس کی پیروی کے لئے
تو گام گام پہ گرتا چلے سنبھلتا جائے

گھنے گھنے وہ برستی عنایتیں جن سے
ضمیر میں شجرِ صد امید پھلتا جائے

کہاں یہ اجنبیوں کے دیار، تیرہ و تار
کہ اپنے پاؤں کی آہٹ سے جی دہلتا جائے

نہ کوئی قرب کی خوشبو نہ کوئی لطف کا رنگ
ہر ایک لمحہ بہاروں کا ہاتھ ملتا جائے

نفس نفس وہی یادوں کی ہشت پہلو کٹار
کہ جس کی دھار پہ کٹ کٹ کے دل پگھلتا جائے

بس اب تو اک شجرِ سایہ دار کی ہے تلاش
ہوائیں چلتی رہیں اور جی بہلتا جائے

○

کوئی سوال نہ کوئی جواب دل میں ہے
بس ایک درد و الم کا سحاب دل میں ہے

جراحتیں جو لگیں تن پہ زیبِ تن کر لیں
جو دل کے زخم تھے ان کا حساب دل میں ہے

اگر لہو ہے تو آنکھوں میں کیوں نہیں آتا
یہ موجِ خوں ہے کہ موجِ سراب دل میں ہے

مدام ظاہر و باطن میں یہ خلیج رہی
نگاہ غرقِ گنہ، احتساب دل میں ہے

صحیفۂ الم روزگار ہاتھوں میں
کھلی ہوئی ترے غم کی کتاب دل میں ہے

نظر کے سامنے اٹھیں گے روز حشر مگر
وہ دل میں دفن رہے گا جو خواب دل میں ہے

اگر جگر میں ہو سارے جہاں کا درد تو خیر
یہ کیا کہ سارے جہاں کا عذاب دل میں ہے

○

کتنے دل کش کچھ اندھیرے، کچھ اجالے ہو گئے
چاند پس منظر میں نکلا، پیڑ کالے ہو گئے

ذوقِ گویائی تو ہے، پر تابِ گویائی کہاں
لفظ خود آ کر مرے ہونٹوں پہ تالے ہو گئے

دیکھنے میں کتنے پائندہ سہارے تھے مگر
ہاتھ میں آئے تو سب مکڑی کے جالے ہو گئے

دیدنی تھی فصلِ گل میں تندیٔ خونِ حیات
یاسمن کے پھول، یوں سمجھو کہ لالے ہو گئے

ہم نے تنہائی کی دھن میں ہائے کیوں چھوڑا وطن
اجنبی سب رفتہ رفتہ دیکھے بھالے ہو گئے

اوّل اوّل وقفِ حیرانی رہے دنیا کے ساتھ
ہوتے ہوتے ہم بھی دنیا سے نرالے ہو گئے

○

جب کبھی خود کو یہ سمجھاؤں کو تو میرا نہیں
مجھ میں کوئی چیخ اٹھتا ہے، نہیں، ایسا نہیں

وارداتِ دل کا قصہّ ہے غمِ دنیا نہیں
شعر تیری آرسی ہے، میرا آئینہ نہیں

کب نکلتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد
اِس گلی کے دوسری جانب کوئی رستا نہیں

تم سمجھتے ہو بچھڑ جانے سے مٹ جاتا ہے عشق
تم کو اِس دریا کی گہرائی کا اندازہ نہیں

اُن سے مل کر بھی کہاں مٹتا ہے دل کا اضطراب
عشق کی دیوار کے دونوں طرف سایا نہیں

کب تری بوئے قبا سے بے وفائی دل نے کی
کب مجھے بادِ صبا نے خون رلوایا نہیں

مت سمجھ میرے تبسم کو مسرّت کی دلیل
جو مرے دل تک اترتا ہو یہ وہ زینہ نہیں

یوں تراشوں گا غزل میں تیرے پیکر کے نقوش
وہ بھی دیکھے گا تجھے جس نے تجھے دیکھا نہیں

ثبت ہیں اِس بام و در پر تیری آوازوں کے نقش
میں، خدا ناکردہ، پتھر پوجنے والا نہیں

خامشی، کاغذ کے پیراہن میں لپٹی خامشی
عرضِ غم کا اس سے بہتر کوئی پیرایہ نہیں

کب تلک پتھر کی دیواروں پہ دستک دیجیے
تیرے سینے میں تو شاید کوئی دروازہ نہیں

○

آؤ پل بھر محو ہو جائیں خیالِ یار میں
سیج پر پھولوں کی سو جائیں جہانِ خار میں

فرق ہوتا ہے بہت، اِس فرق کو پہچانئے
دیدۂ بے خواب میں اور دیدۂ بیدار میں

یہ خزاں کا رنگ ہے یا زرد رُو آکاس بیل
دھوپ کی مانند ہے پھیلی ہوئی اشجار میں

جم گیا ہے جب سے دل میں سر کٹانے کا خیال
ہم کو جانے کیا نظر آنے لگا تلوار میں

میں اگر چپ ہوں تو سمجھو نافۂ سربند ہوں
جو سخن لب تک نہ آیا بس گیا کردار میں

○

درِ خزینۂ صد راز کھولتا ہے کوئی
نہ جانے کون ہے وہ، مجھ میں بولتا ہے کوئی

عجب کرید، عجب بے کلی سی ہے جیسے
مجھے مری رگِ جاں تک ٹٹولتا ہے کوئی

ہجوم ہے مرے سینے میں ابر پاروں کا
گہر بکھیرنے والا ہوں، رولتا ہے کوئی؟

حیات و مرگ و طلوع و غروب ہے دنیا
کہ پر سمیٹتا ہے کوئی، تولتا ہے کوئی

ہوا کا لمس، یہ بوندیں خنک خنک خورشید
مجھے تو آج فضاؤں میں گھولتا ہے کوئی

○

خرد سے دور غمِ تُند خو میں اچھے تھے
اُسی جنوں میں اُسی ہاؤ ہو میں اچھے تھے

نکل کے آپ سے باہر، خراب و خوار ہوئے
مدام غرق ہم اپنے لہو میں اچھے تھے

غرورِ زُہد سے رنجِ گناہ بہتر تھا
خراب، شغلِ شراب و سبو میں اچھے تھے

وہ رائگاں بھی اگر تھی تو رائگاں نہ کہو
کہ روز و شب مرے اُس جستجو میں اچھے تھے

اگر چہ وہ بھی نہ تھے حسبِ آرزو لیکن
وہ دن، کٹے جو تری آرزو میں، اچھے تھے

ہوا ہوئی ہے موافق، ہمیں وہیں لے چل
سفینہ راں! ہم اُسی آبجو میں اچھے تھے

○

سینوں میں تپش ہے کبھی شورش ہے سروں میں
کیا چیز بسا دی گئی، مٹی کے گھروں میں

چلتا ہوں سدا ساتھ لئے اپنی فصیلیں
پہچان سکا کون مجھے ہم سفروں میں

اُڑنا ہے تو تہذیب کرو سوزِ دروں کی،
یہ ورنہ کہیں آگ لگا دے نہ پروں میں

غیروں میں ہوئی عام تری دولتِ دیدار
اک کحُلِ بصر تھا کہ لُٹا بے بصروں میں

دو گام پہ تم خود سے بچھڑ جاتے ہو خورشیدؔ
اور لوگ سمجھتے ہیں تمہیں راہبروں میں

○

کچھ مہک اُس نافہء گم گشتہ کی لاتی تو ہیں
کچھ ہوائیں دشتِ ماضی سے اِدھر آتی تو ہیں

جنگلوں کو روح ترسے گی تو جاؤ گے کہاں
ہر طرف آبادیاں بڑھتی چلی جاتی تو ہیں

لوگ پتھر ہو گئے سنجیدگی کے نام پر
شکر ہے ہم آج تک تھوڑے سے جذباتی تو ہیں

شکر ہے تارِ نگہ کو قیدِ تنہائی نہیں
آنکھ کے زنداں میں اشکوں کے ملاقاتی تو ہیں

گم ہوں میں خورشیدؔ خاشاکِ بہارِ رفتہ میں
ورنہ شاخیں فصلِ گل میں اب بھی لہراتی تو ہیں

○

ناحق ہوئے خراب، اتر کر خزینے میں
وہ لعلِ شب چراغ کہاں اس دفینے میں

اے محوِ خواب غُرفہ نشیں جھانک کر تو دیکھ
کن سیڑھیوں پہ ہے کفِ سیلاب زینے میں

یاں بُت شکن بہت ہیں، کوئی خود شکن نہیں
توڑے جو خود کو ڈوب کے اپنے پسینے میں

پھول اب بھی کِھل رہے ہیں مگر وہ صبا کہاں
ہوتا ہے کتنا فرق مہینے، مہینے میں

شاید کسی بھنور میں کُھلے ناخدا کی آنکھ
ساحل کے خواب دیکھ رہا ہے سفینے میں

مدت ہوئی کہ دل سے ترا نقش اڑ گیا
اب دیکھیں کس کا نام کھُدے اِس نگینے میں

○

آ یئے رولیں کہیں، رونے سے چین آ جائے گا
ورنہ دردِ دل بھری محفل میں پکڑا جائے گا

چاند کی چاہت ہے لیکن چاند کو کم دیکھئے
ورنہ جب آنکھوں میں بس جائے گا گہنا جائے گا

جنبشِ موجِ صبا سے بھی اگر لبِ ہل گئے
بات پکڑی جائے گی محشر اٹھایا جائے گا

سردیوں کی اوس میں ٹھٹھرا ہوا اک اجنبی
کل تری دیوار کے سائے میں پایا جائے گا

دید کی مہلت تو ملتی ہے مگر کیا دیکھئے
آنکھ بجھ جائے گی آخر پھول کمھلا جائے گا

اے صبا! فرصت نہیں خاکسترِ دل سے نہ کھیل
ہم اگر روئے، تو پھر تا دیر رویا جائے گا

○

لب سے دل کا دل سے لب کا رابطہ کوئی نہیں
حسرتیں ہی حسرتیں ہیں مدّعا کوئی نہیں

حرفِ غم ناپید ہے، آنکھوں میں نم ناپید ہے
درد کا سیلِ رواں ہے راستا کوئی نہیں

اپنے من کا عکس ہے، اپنی صدا کی باز گشت
دوست، دشمن، آشنا، نا آشنا، کوئی نہیں

سب کے سب اپنے گریبانوں میں ہیں ڈوبے ہوئے
گل سے گُل تک رشتۂ موجِ صبا کوئی نہیں

حالِ زار ایسا کہ دیکھے سے ترس آنے لگے
سنگدل اتنے کہ ہونٹوں پر دعا کوئی نہیں

کیا کوئی راکب نہیں ہم میں سمندِ وقت کا
نقشِ پا سب ہیں تو کیا زنجیرِ پا کوئی نہیں

میں تو آئینہ ہوں سب کی شکل کا آئینہ دار
بزم میں لیکن مجھے پہچانتا کوئی نہیں

دل کے ڈوبے سے مٹی دستِ شناور کی سکت
موج کی طغیانیوں سے ڈوبتا کوئی نہیں

آنکھ میچو گے تو کانوں سے گزر آئے گا حسن
سیل کو دیوار و در سے واسطہ کوئی نہیں

عرش کی چاہت ہو یا پاتال کا شوقِ سفر
ابتدا کی دیر ہے پھر انتہا کوئی نہیں

کارواں، خورشیدؔ جانے کس گپھا میں کھو گیا
روشنی کیسی، کہ صحرا میں صدا کوئی نہیں

○

متّحد باہمدگر مانندِ جسم و جاں رہے
ہم برنگِ زخمِ دل تم صورتِ پیکاں رہے

جیسے نافے کو لئے پھرتا ہے آہو دشت
ہم بھی اپنے سرِ باطن کے لئے زنداں رہے

خواہشوں کی چلمنیں روئے حقیقت پر رہیں
کیسے کیسے خواب، اِن آنکھوں میں آویزاں رہے

تم صبا کی طرح آئے اور رخصت ہو گئے
ہم مثالِ شاخِ تنہا دیر تک لرزاں رہے

دل کے دامن میں رہا اک کرمکِ شب تاب سا
تم تصور میں کبھی پیدا کبھی پنہاں رہے

کون پہچانا کسی کو چار دن زیرِ فلک
لوگ آئے اور اپنے آپ میں مہماں رہے

○

سارا جہان سرد و سیہ، یاس کی طرح
دل اُس میں ٹمٹماتی ہوئی آس کی طرح

رُخ سے عیاں بھی ہے، مرے دل میں نہاں بھی ہے
تیرا خیال شدّتِ احساس کی طرح

تجھ سے بچھڑ کے صحبتِ گل میں ملا قرار
اِس میں بھی کچھ تو ہے، تری بوباس کی طرح

ترسے کسی کے بوسہء پا کو بھی عمر بھر
سنسان راستوں پہ اُگی گھاس کی طرح

کانوں میں پھول پہنے ہوئے کنجِ دل میں آج
اترا ہے کون شاخِ املتاس کی طرح

یونہی، کہیں کہیں، تری یادوں کے پھول تھے
تھی ورنہ زندگی کسی بن باس کی طرح

خورشید اُس کی آنکھ کی تابانیاں نہ دیکھ
وہ زہر بھی ہے پارۂ الماس کی طرح

○

گھول جا دن بھر کا حاصل اِس دلِ بے تاب میں
ڈوب جا، اے ڈوبتے سورج مرے اعصاب میں

آنکھ میں ہر لحظہ تصویریں رواں رہنے لگیں
جم گیا ہے خواب سا اک، دیدۂ بے خواب میں

دل ہمارا شاخساروں سے، گلوں سے کم نہیں
اے صبا کی موجِ لرزاں، کچھ ہمارے باب میں

ہاں اِسی تدبیر سے شاید بنے تصویرِ دل
رنگ ہم نے آج کچھ، گھولے تو ہیں سیماب میں

دھیان بھی تیرا تری موجودگی سے کم نہ تھا
کُنجِ خلوت میں بھی ہم جکڑے رہے آداب میں

دسترس ہے موج کی ساحل سے ساحل تک فقط
تہ کو جا پہنچے اگر اُترے کوئی گرداب میں

پیشِ دل کچھ اور ہے پیشِ نظر کچھ اور ہے
ہم کھلی آنکھوں سے کیا کیا دیکھتے ہیں خواب میں

○

گفتگو ''ترکِ خامشی'' ہے فقط
ہم سفر ایک اجنبی ہے فقط

عہدِ رفتہ کے ولولوں کا نشاں
اک مسلسل سی بے کلی ہے فقط

دیکھنا بھالنا گیا ترے ساتھ
آنکھ مدت سے سوچتی ہے فقط

ہر طرف اک اتھاہ سناٹا
چاپ اپنی ہی گونجتی ہے فقط

ہر طرف بے پناہ تاریکی
اپنی آنکھوں کی روشنی ہے فقط

اجنبیت کے یخ کدوں میں دوست
خود کلامی پہ زندگی ہے فقط

ہم کہاں اور جوازِ شکوہ کہاں
نالہ اظہارِ بے کسی ہے فقط

کر حفاظت متاعِ حیرت کی
حاصلِ زندگی یہی ہے فقط

اب دماغِ سخن بھی ہے کس کو
عمر مدّت سے کٹ رہی ہے فقط

○

ہوا جو دل کی طرف کل صبا کا روئے سخن
تڑپ اٹھی مری نس نس میں آبجوئے سخن

کھلے جو زخم تو رہ رہ کے یاد آنے لگے
وہ جن کے قرب میں ہوتی رہی نموئے سخن

کبھی وہ دوست، کہ تھے دست و ساعد و بازو
وہ ہم پیالۂ احساس وہم سبوئے سخن

وہ راز دار نگاہیں فصاحتوں کی امیں
وہ جن کے بعد نہ رہتی تھی جستجوئے سخن

کبھی وہ دل میں اُترتی ہوئی حسیں رفتار
وہ جس سے جلوہ گہِ کہکشاں تھی کوئے سخن

غزل غزل وہ اَدائیں وہ عنبریں نشتر
وہ جن کی خامشیاں بھی لئے تھیں خُوئے سخن

اور اب اُجاڑ ہے ہر شہرِ ظاہر و باطن
نہ سوز و سازِ خموشی نہ رنگ و بُوئے سخن

کَٹی ہوئی ہے دیارِ طرب سے راہِ خیال
اَٹی ہوئی ہے غُبارِ اَلم سے جُوئے سخن

شہابِ ثاقبِ الہام اب کہاں خُورشید
قلم کے زور سے رکھتا ہوں آبروئے سخن

○

پیشِ نظر جو پھر وہی دیوار و در ہوئے
بامِ تصورات پہ تم جلوہ گر ہوئے

ٹکڑے اڑے جگر کے تو نکھرا غزل کا روپ
ہم سنگ باریوں کے سبب شیشہ گر ہوئے

اُس پیرہن کے لمس کو ترسے ہیں عمر بھر
جس کے لئے غبارِ سرِ رہگزر ہوئے

آئی تری صدا تو سماعت میں ڈھل گئے
ابھرا ترا جمال تو تارِ نظر ہوئے

اِن راستوں میں آج بھی ہے اُن دنوں کی باس
جو دن کسی کی ہمقدمی میں بسر ہوئے

دل آج بھی چراغ اُسی انجمن کا ہے
صدیاں گزر گئیں جسے زیر و زبر ہوئے

اب وہ دیار بھی ہمیں پہچانتا نہیں
اک عمر جس میں نالہ سرا در بدر ہوئے

راہیں کٹھن ہوئیں تو مہکنے لگی غزل
وہ محملِ سخن میں مرے ہمسفر ہوئے

خورشید میری سوختہ پائی کے فیض سے
سب نقشِ پا چراغِ سرِ رہگزر ہوئے

○

بڑا عجیب سماں آج رات خواب میں تھا
میں اُن کے پاس تھا، سیّارہ آفتاب میں تھا

صدف صدف جسے ڈھونڈ آئے ڈھونڈنے والے
خدا کی شان، وہ موتی کسی حباب میں تھا

اِدھر سے دست و نگاہ و زباں تمام سوال
اُدھر سے ایک سکوتِ گراں جواب میں تھا

ہوا میں ایک ادھورا فسانہ کہتا ہوا
یہ چاک چاک ورق جانے کس کتاب میں تھا

تمہاری بزم سے تنہا نہیں اٹھا خورشیدؔ
ہجوم درد کا اک قافلہ رکاب میں تھا

○

جئیں کچھ اور تو ہو جائے زندگی کچھ اور
ابھی تھی زہر، ابھی انگبیں، ابھی کچھ اور

بجھا کے شمع نہ کر میرے غم کا اندازہ
شبِ فراق کی ہوتی ہے تیرگی کچھ اور

سنا ہے سانپ کے من میں ہے سانپ کا تریاق
اگر ہے یوں، تو سہیں نیشِ آگہی کچھ اور

اِسی سبب سے نہیں صلح آئنے سے مری
کہ میں کچھ اور ہوں اور میری زندگی کچھ اور

قلندرانہ نہ کیوں جادۂ وفا پہ چلوں
کہ احتیاط سے بڑھتی ہے گمرہی کچھ اور

○

کچھ اس ادا سے کوئی دمبدم لبھائے مجھے
کہ ہارنے بھی نہ دے اور آزمائے مجھے

اِس انتظار میں ہوں نقشِ رائگاں ہو کر
ترا کرم کسی محراب میں سجائے مجھے

ترے نثار کسی ایسے غم گسار کو بھیج
کہ دل کی بھول بھلیوں سے ڈھونڈ لائے مجھے

یہ جی میں ہے کہ سراپا وہ نغمہ بن جاؤں
کہ جس کو تجھ سے محبت ہو گنگنائے مجھے

کسی کی دھن میں پریشاں تو ہوں بکھر ہی نہ جاؤں
گلے نہ موجۂ بادِ صبا لگائے مجھے

گلوں سے کم نہیں کانٹوں کی سیج بھی خورشیدؔ
خیالِ یار اگر چین سے سلائے مجھے

○

رہینِ صد گماں بیٹھے ہوئے ہیں
مگر ہم رائگاں بیٹھے ہوئے ہیں

بظاہر ہیں بھری محفل میں لیکن
خدا جانے کہاں بیٹھے ہوئے ہیں

اِدھر صحنِ چمن میں مجھ سے کچھ دُور
وہ مجھ سے سرگراں بیٹھے ہوئے ہیں

اُدھر شاخِ شجر پر دو پرندے
مثالِ جسم و جاں بیٹھے ہوئے ہیں

ستارے ہیں کہ صحرائے فلک میں
بھٹک کر کارواں بیٹھے ہوئے ہیں

کنویں کی تہ میں جھانکو عکس در عکس
یہاں سات آسماں بیٹھے ہوئے ہیں

کھنچی ہیں دل پہ پتھر کی لکیریں
نقوشِ رفتگاں بیٹھے ہوئے ہیں

ہمیں چاہو ہماری قدر کر لو
تمہارے درمیاں بیٹھے ہوئے ہیں

○

رہی ہے پردۂ اُلفت میں مصلحت کیا کیا
عداوتوں میں ہوئی ہے مفاہمت کیا کیا

مرے عزیز وطن کی فضا نے بھر دی ہے
مری سرشت کے اندر منافقت کیا کیا

کبھی اصول کی غیرت کبھی زیاں کا سوال
دماغ و دل میں رہی ہے مشاورت کیا کیا

صدائے دل کو تہِ دل میں قید کر کے رکھا
رہا ہے طوقِ گلو شوقِ عافیت کیا کیا

مہک تھی جو لہو کی تو چونک کر ہم نے
ہوا سے پوچھی ہے زخموں کی خیریت کیا کیا

بہت عزیز ہیں آنکھوں کی پتلیاں لیکن
ملے ہیں دُکھ بھی مجھے اِن کی معرفت کیا کیا

بہت دنوں میں کل آئینہ سامنے پا کر
ہوئی ہے عمرِ گزشتہ کی تعزیت کیا کیا

اَٹا ہوا بسرو چہرہ سیم و زر کا غبار
ملی ہے لاشۂ افکار کی دیت کیا کیا

نہاں ہے ترکشِ امکاں میں ناوکِ تقدیر
مدام سر پہ ستارے ہیں اَن گنت کیا کیا

○

مدتوں کی خشک پلکوں کو بھگونا چاہیے
سایۂ اشجار میں تا دیر رونا چاہیے

ایں سوئے افلاک ہنگامے بپا ہیں نو بہ نو
آں سوئے افلاک آخر کچھ تو ہونا چاہیے

مزرعِ ہستی میں ہنگامِ دِرَو بھی آئے گا
سوچ کر اس سرزمیں میں بیج بونا چاہیے

آنکھ کھلنے پر ملے شاید مرادوں کا جہاں
چند صدیوں تک کہیں غاروں میں سونا چاہیے

ایک جانب گریۂ شب، ایک جانب قہقہے
کس لڑی میں دوستو! خود کو پرونا چاہیے

○

اس جہاں کے تو ہے شایاں صرف مرنے کی امنگ
لغو ہے کتنی یہاں کچھ کر گزرنے کی امنگ

کس طرح دنیا سے رخصت ہو پریشانی کہ ہے
ذرّے ذرّے کی طبیعت میں بکھرنے کی امنگ

دمبدم دستِ فنا میں سوچتا ہے اب حباب
جانے کیوں سر میں سمائی تھی ابھرنے کی امنگ

اب تو جینے کی یہی صورت ہے اے اہلِ جنوں
چھوڑ کر نقشِ جہاں میں رنگ بھرنے کی امنگ

اک بہشتِ بے خودی اور لذتِ برگِ حشیش
سایۂ تاک اور دل میں کچھ نہ کرنے کی امنگ

○

یا تو اُس برقِ تپاں کا سامنا مت کیجیے
یا دمِ تیغِ تجلّی کا گِلا مت کیجیے

گم نہ ہو جائیں کہیں اِک دن ہجومِ عکس میں
اِس قدر سینے کو آئینہ نما مت کیجیے

گنبدِ دل میں ابد تک گونجتی ہے ہر نوا
آپ خود ڈر جائیں گے اِس میں صدا مت کیجیے

موج سے لیجے خضر کی آمد و شد کا سراغ
سطحِ دریا پر تلاشِ نقشِ پا مت کیجیے

ہستیٔ تارِ نفس ہے مثلِ تارِ عنکبوت
کیجیے کیا اِس جہاں میں اور کیا مت کیجیے

○

سینے میں میرے خلدِ بریں کی روش بھی ہے
دوزخ کے شعلہ نفس کی تپش بھی ہے

وہ آرزو بھی ہے کہ سوئے عرش لے اڑے
اور اس کے ساتھ ساتھ زمیں کی کشش بھی ہے

گو ہے اِسی کی آمد و شد پر مدارِ زیست
تارِ نفس میں تیغِ دو دم کی بُرِش بھی ہے

حدِّ نظر پہ خضر بھی ہے منتظر مگر
رستے میں ہر قدم پہ کھڑا راکھشش[1] بھی ہے

جو گاہ گاہ آنکھ کو نم دیدہ کر سکے
باطن میں آپ کے کوئی ایسی خلش بھی ہے

---

[1] اس لفظ میں تصرف پر علماء سے معذرت

○

جانے کس کس کا شریکِ انجمن، یادوں میں ہے
ایک پہلو سے دلِ پابند آزادوں میں ہے

دیدہ و دل اب بھی جاگ اٹھتے ہیں تیرے نام پر
حسرتِ تعمیر اب تک خانہ بربادوں میں ہے

وہ جو توڑے گا طلسمِ سامری، وہ بھی اِنہی
راہ سے بھٹکے ہوئے لب تشنہ شہزادوں میں ہے

ہر عمارت میں نظر آنے لگے گی ایک دن
یہ کجی جو اِن دنوں آنکھوں کی بنیادوں میں ہے

ہو کسی کا صید تو ہم ڈھال بن جائیں مگر
اِس کا کیا کیجئے کہ دل آپ اپنے صیادوں میں ہے

○

وہ قناعت کا طلسمِ خواب گوں جاتا رہا
رشک جب سے آنکھ میں آیا سکوں جاتا رہا

ذہن کے مقتل میں امکانوں کی لاشیں بھر گئیں
وہ یقینِ بے قیاس و بے چگوں جاتا رہا

کیوں کشادِ کار میں اکثر گرہ رہنے لگی
کار فرما تھا جو دستِ غیب کیوں جاتا رہا

حادثہ یہ ہے کہ سیلابِ زماں کے رو برو
لوحِ دل سے 'رفتہ رفتہ' نقشِ خوں جاتا رہا

اب دیے لاکھوں بھی جل جائیں تو ظلمت کم نہ ہو
وہ چراغانِ جہانِ اندروں جاتا رہا

○

آوارۂ غربت ہوں ٹھکانہ نہیں ملتا
ناوک ہوں مجھے کوئی نشانہ نہیں ملتا

جن لوگوں میں رہتا ہوں، میں اُن میں سے نہیں ہوں
ہوں کون، مجھے اپنا زمانہ نہیں ملتا

دیوار تو اِس دور میں ملتی ہے بہر گام
لیکن تہِ دیوار خزانہ نہیں ملتا

مدت سے ہے اشکوں کا تلاطم پسِ مژگاں
رونے کے لئے کوئی بہانہ نہیں ملتا

مدت سے تمنا ہے کہ یہ بوجھ اتاریں
مدت سے کوئی دوست پرانا نہیں ملتا

ہے رخش سبک سیر بہت عمرِ رواں کا
گر جائے کوئی شے تو اٹھانا نہیں ملتا

○

پہلے جہاں کے رنج و محن میں لگا دیا
دل دُکھ گیا تو مشقِ سخن میں لگا دیا

جب ہم ہرے بھرے تھے تو تھے وقفِ دشت و در
دن ڈھل گئے تو صحنِ چمن میں لگا دیا

جز اس کے کیا کہوں کہ خدا نے کہیں کہیں
اک روح کا سا ہاتھ بدن میں لگا دیا

کیا اب بھی زندہ ہے وہ جراحت کہ دل میں تھی
پیوندِ خوں یہ کس نے کفن میں لگا دیا

خورشید اب سخن ترا رنگیں کہاں سے ہو
سارا لہو تو اُس کی لگن میں لگا دیا

○

بے دلی زوروں پہ تھی گلشن بھی ویرانہ رہا
ہم بھی بیگانے رہے، سبزہ بھی بیگانہ رہا

دل رہا آشوبِ تنہائی میں پیہم سینہ کوب
یوں تعلق تو سبھی سے آشنایانہ رہا

توڑتا ہے کون شب بھر جسم کی دیوار کو
بند مجھ میں عمر بھر یہ کون دیوانہ رہا

خواب میں بھی اُن کی صورت دیکھنا ہے اب محال
جن کا میری آنکھ کی پتلی میں کاشانہ رہا

چار سو تپتے حقائق کی کڑی بے مہر دھوپ
دل پہ لیکن سایہ افگن ایک افسانہ رہا

○

بات وہ کہتا ہوں جو ہم رنگِ خاموشی رہے
درس وہ دیتا ہوں جو رہنِ فراموشی رہے

آدمی پر تلخ ہو جاتا ہے ظاہر کا سفر
راہ میں حائل اگر باطن کی سرگوشی رہے

اہلِ دل کے نام کیا شرطِ گراں لکھ دی گئی
دل تبھی رہتا ہے جب ذوقِ زیاں کوشی رہے

نقشِ ماتم تا ابد نقشِ جبیں ہو یا نہ ہو
تا ابد لیکن طبیعت کی سیہ پوشی رہے

خواب کو تعبیر ملتی ہے، غموں کو اعتدال
ہوش میں شامل اگر تھوڑی سی بے ہوشی رہے

○

سب داغ ہیں بیدار بہت، سینے کے اپنے
موہوم ہیں آثار بہت، جینے کے اپنے

بند آنکھ کیے کانِ جواہر میں کھڑا ہوں
گوہر مجھے یاد آتے ہیں گنجینے کے اپنے

اتنے بھی نہ ہوں اپنی اداؤں کے قتیل آپ
آئینے میں کچھ رنگ ہیں آئینے کے اپنے

خود اُڑ کے پہنچتا ہے ہمیں رزق ہمارا
کیوں خوار پھریں کھوج میں روزینے کے اپنے

یا ایک نیا خلعتِ شاہانہ بہرگام
یا پھر یہی دو رخت ہوں پشمینے کے، اپنے

○

تو ہے کہ چیستاں کی عبارت ہے تہ بہ تہ
دل ہے کہ سنگ بستۂ حیرت ہے تہ بہ تہ

جو آنکھ دیکھنے میں خرابہ دکھائی دے
سمجھو کہ اُس میں کوئی امانت ہے تہ بہ تہ

بحرِ انا ہوں میری تہوں میں اتر کے دیکھ
خوابیدہ مجھ میں وقت کی میّت ہے تہ بہ تہ

وہ چشم سرمہ سا کہ جسے بے زباں کہیں
اُس کی خموشیوں میں اشارت ہے تہ بہ تہ

فرصت کہاں کہ غیر سے ہم دشمنی کریں
اپنا وجود ایک مصیبت ہے تہ بہ تہ

شاید کوئی گیا ہو زمانے سے کامگار
اپنی تو زیست کانِ ندامت ہے تہ بہ تہ

○

آدمی دل کے سویدا سے عبارت ہے فقط
ایک ہی پتھر پہ قائم یہ عمارت ہے فقط

ہاتھ میں امید کے، ہے ایک تارِ عنکبوت
آنکھ میں اک واپسیں تارِ بصارت ہے فقط

پختگی کو آن پہنچا ہے خمیرِ بے دلی
راہ میں حائل کوئی دن کی حرارت ہے فقط

اے زباں تخمِ خموشی بو کے دیکھیں آج سے
آج تک کی گفتگو ساری اکارت ہے فقط

چشم پوشی پر گزر اوقات کر لیتا ہے دل
زندگی کیا ہے، تغافل کی مہارت ہے فقط

○

یادِ ایامے، کوئی وجہِ پریشانی تو تھی
آنکھ یوں خالی نہیں تھی، اس میں حیرانی تو تھی

لب پہ مہرِ خامشی پہلے بھی لگتی تھی مگر
آہ کی رخصت تو تھی، اشکوں کی ارزانی تو تھی

تھی نظر کے سامنے کچھ تو تلافی کی امید
کھیت سوکھا تھا، مگر دریا میں طغیانی تو تھی

بزم سے اٹھے تو کیا، خلوت میں جا بیٹھے تو کیا
ترکِ دنیا پر بھی دنیا، جانی پہچانی تو تھی

درد اک جوہر ہے، پیکر سے غرض رکھتا نہیں
آنکھ میں آنسو نہ تھے، لب پر غزل خوانی تو تھی

○

آ دلِ ناشاد چل اسبابِ ناشادی سے دور
مکتبِ فطرت میں، استادوں کی استادی سے دور

پڑھ رہا ہوں سب کفِ دستِ مناظر کے نقوش
خیمہ زن ہوں خلوتِ کہسار میں وادی سے دور

سرنگوں بیٹھا ہوں اپنی ذات میں ڈوبا ہوا
اس جہانِ خوب و ناخوب و غم و شادی سے دور

دے رہائی کی سزا، ذوقِ اسیری دیکھ کر
یہ ستم بھی تو نہیں ہے اس کی صیادی سے دور

شہر اجڑتا ہو تو ہم صحرا کا رستا لیں مگر
کس طرح بھاگے کوئی پا طن کی بربادی سے دور

سوزِ دل میں گوندھ لو اپنی نوا کا تار و پود
گنگناؤ جا کے اِن شعروں کو آبادی سے دور

O

یہ تو ''بہنا'' ہے سراسر بے جدال و بے خلاف
''تیرنا'' وہ ہے کہ ہو رفتارِ دریا کے خلاف

جی میں آتا ہے کہ اب سارے جہاں سے دور دور
کنجِ دل میں بیٹھیے اور سوچیے اپنے خلاف

ہے سرِ جلوت، مرے حق میں رواں میری زباں
آئنہ خلوت میں بولے گا مگر میرے خلاف

میں ترا، میرے قدم تیرے، مرا رستہ ترا
اے خدا، کیا خاک چل سکتا ہوں میں تیرے خلاف

جسم کو پابندِ رسمِ کارواں رہنا پڑا
تھی مگر دل کی روش، سب سے الگ سب سے خلاف

○

کچھ فنا کے زیرِ پا ہوں، کچھ فنا آمادہ ہوں
خاک کا پتلا ہوا کی راہ میں استادہ ہوں

کر رہا ہوں ذرّہ ذرّہ ریگِ ساعت کا شمار
زندگانی کا اسیر اور موت کا دلدادہ ہوں

جھیلتا ہوں سختیاں، رنگِ طبیعت کے خلاف
وقت کے ہاتھوں گدا ہوں، اصل کا شہزادہ ہوں

صحبتِ ناجنس میں محصور ہوں شام و سحر
میں سمندر میں زمینِ خشکِ دور افتادہ ہوں

اتنا آساں ہوں کہ جس کو ماننا آساں نہیں
ہے یہی پیچیدگی میری کہ حرف سادہ ہوں

○

چار دن کو ہے یہاں شرطِ اقامت کیا کیا
فرصتِ زیست میں شامل ہے مصیبت کیا کیا

سر پھرے لوگ ہیں ہم، اپنے جنوں کی رو میں
سوچ لیتے ہیں دلِ زار کی قیمت کیا کیا

وہ تو کہیے کہ گزر کر خس و خاشاک ہوئے
ورنہ سنگین تھی، حالات کی صورت کیا کیا

آج مشکل ہے بہت وعدۂ فردا پہ یقیں
اور کل دوش پہ آئے گی ندامت کیا کیا

تم تو کیا ہو سرِ دیوار زمانہ خورشید
رائگاں ہو کے مٹا نقشِ فضیلت کیا کیا

○

کڑی ہے دھوپ، گھٹا بن کے خود پہ چھاتے جائیں
کسی کو یاد کریں اوس میں نہاتے جائیں

یہ دل کی بھول بھلیاں، یہ ایک سے رستے
ہر ایک موڑ پہ کوئی نشاں لگاتے جائیں

سیاہ کیوں ہو، یہ طاق و دریچہ و محراب
چلے ہیں گھر سے تو جلتا دیا بجھاتے جائیں

یہ میری آپ کی، ہمسائیگی کی آئنہ دار
جو ہو سکے تو یہ دیوار بھی گراتے جائیں

مذاقِ اہلِ جہاں کو بھلی لگے نہ لگے
شجر حجر تو سنیں گے، غزل سناتے جائیں

○

کہاں چلوں کہ جہاں دل دکھا سکے نہ کوئی
کسی پہ اپنی خدائی جتا سکے نہ کوئی

کہیں کسی کی طرف مڑ کے دیکھنا نہ پڑے
بجز ندائے محبت' بلا سکے، نہ کوئی

اگر کسی سے ملوں' کوئی سدِّ راہ نہ ہو
اگر بچوں تو مرے پاس آ سکے نہ کوئی

حدیثِ مکر و ریا کو سماعتیں نہ ملیں
حدیثِ لطف کو دل سے بھلا سکے نہ کوئی

سیاہ، سر پہ کوئی دست اقتدار نہ ہو
مرے چراغ، مرا دل بجھا سکے نہ کوئی

کسی کی جنبشِ ابرو پہ جبرِ خندہ نہ ہو
حزیں ہو طبع، تو مجھ کو ہنسا سکے نہ کوئی

وہ چاہتا ہوں بہشتیں جو مل سکیں نہ کہیں
وہ مانگتا ہوں ستارے جو لا سکے نہ کوئی

○

بے خود، صفتِ بادِ صبا آ کے گلے مل،
کم کم کہیں کھلتے ہوئے پھولوں کے تلے مل

گلنار سے چہرے پہ رکھے دستِ حنا کو
ہم رنگِ شفق ہو کے کبھی شام ڈھلے مل

اب کوئی بھی شب، بن ترے دیکھے نہ کٹے گی
اب چاند کی قندیل جلے یا نہ جلے مل

ہاں دل سے کبھی شوقِ ملاقات نہ نکلے
جب گردشِ افلاک ذرا سر سے ٹلے، مل

پل بھر کو اگر جبر کا سیلاب تھمے، آ
دم بھر کو اگر وقت پہ کچھ زور چلے، مل

ناگفتہ بہاروں کے اشاروں کی سمجھ بات
جب سوکھی ہوئی شاخ ہری ہو کے پھلے، مل

دنیا کی نگاہوں سے نہاں آخرِ شب جاگ
جب صحنِ گلستاں میں کلی آنکھ ملے، مل

○

کیا کہیں کیونکر بسر ایّامِ فانی ہو گئے
ہاتھ رکھا دل پہ محوِ سوز خوانی ہو گئے

دمبدم جلتے ہیں چوبِ خشکِ صحرا کی طرح
کاروانِ رفتہ ہم تیری نشانی ہو گئے

اُس پہ تیری آنکھ نے شبنم بھی ارزانی نہ کی
سنگریزے، جس نوا کاری سے پانی ہو گئے

ہم تلاشِ لعلِ بے ہمتا میں اب نکلے کہ جب
شام کے پر تو سے پتھر ارغوانی ہو گئے

اور کیا ہوگا جہاں کی بے ثباتی کا ثبوت
تم کہ سرتاپا حقیقت تھے، کہانی ہو گئے

○

بزمِ جہاں میں جب کسی شے کی کمی نہ تھی
ہم نے وہ صبحِ عیش بھی دیکھی ترے بغیر

اب تُو نہیں، تو ہے ترا غم شاملِ حیات
تیرے فراق میں بھی نہ گزری ترے بغیر

اک بے خودی میں ہم کو تھکن کا پتا نہ تھا
ورنہ رہِ حیات کٹھن تھی ترے بغیر

کیا کیا نہیں رہا میں فضاؤں سے شرمسار
جب چاندنی شباب پہ آئی ترے بغیر

اب کے بھی گلستاں سے بہاروں کا کارواں
بے رنگ و بو گزر گیا، یعنی ترے بغیر

○

وہ دن بھی تھے کہ صورتِ نام و نگیں تھے ہم
یہ دن بھی ہیں کہ جیسے کبھی دوستی نہ تھی

وہ ابتدائے عشق کے دن بھی تھے خوب دن
جب اپنے سر سے کج کلہی یوں گئی نہ تھی

حدِّ نظر پہ وہ بھی خراماں تھا روز و شب
اور صبر سے بھی دل کو ابھی دشمنی نہ تھی

وہ روز و شب کہ جن میں نگاہیں زبان تھیں
ہم چپ تھے، کوئی بات مگر ان کہی نہ تھی

اُس وقت بھی مگر یہی بے تابیاں تھیں دوست
اُس وقت بھی نویدِ سکوں تو ملی نہ تھی

حسرت وہ شمع ہے جسے بجھنا حرام ہے
عینِ وصال میں بھی یہ قاتل مٹی نہ تھی

بے جا ہے شکوۂ غمِ عشق اضطراب میں
تھا کب کہ اپنے دل کو کوئی بے کلی نہ تھی

○

دل میں کسک، نہ آنکھ میں آنسو، نہ سر میں خاک
اِس شہرِ بے حسی میں صبا رائگاں گئی

کیا ڈھونڈتے ہیں جلتے ہوئے خار و خس میں لوگ
بجلی زمیں کو چھو کے سوئے آسماں گئی

کہنے کو ساتھ ساتھ گئے ہم، جہاں گئے
شیشے کی اک فصیل مگر درمیاں گئی

آئینہ کیوں نہ توڑ سکے بت شکن تھے آپ
کہیے تو، اب وہ قوتِ بازو کہاں گئی؟

○

یہ کام چشمِ تصوّر کا ہے بہ فیضِ فراق
تجھے وصال میں جی بھر کے کس نے دیکھا ہے

کسی کو خونِ جگر بھی کسی کا ہے پایاب
کوئی کسی کی نگاہوں میں ڈوب جاتا ہے

بھرے جہاں میں بھی ملتی کہاں ہے تنہائی
حصارِ ذات مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

جہانِ غم سے تو پتھر اٹھا کے لاتا ہوں
گہر تو دل کی جوالا میں آ کے ڈھلتا ہے

○

فضا میں آج بہت دیر یاد آتے رہے
مجھے بہارِ گزشتہ کے بال و پر اپنے

چلو کہ دیکھ تو آئیں زمینِ اعدا میں
وہ اپنی جان سے پیارے مکاں، وہ گھر اپنے

فغاں! کہ دستِ عدو میں بنے ہوئے ہیں تبر
وہ اپنے ہاتھ کے بوئے ہوئے شجر اپنے

گلُوں نے مجھ کو بھی دی تھی صلائے گُل چینی
زمیں کا خون مگر کون اٹھائے سر اپنے

○

خدا کا نام اِس محفل میں کوئی لے تو دل میں لے
ہجومِ نا امیداں کفر پر آمادہ بیٹھا ہے

سرِ خاکستر صد آرزو' دل کا یہ عالم ہے
کہ جیسے دشتِ غربت میں کوئی شہزادہ بیٹھا ہے

ہزاروں فلسفوں کی خاک اڑائی تب کہیں جا کر
طبیعت میں خیالِ پیشِ پا افتادہ بیٹھا ہے

دلِ ہر ذرّہ میں تھی حسرتِ ہمراہیِ محمل
بہت تھک ہار کر آخر غبارِ جادہ بیٹھا ہے

○

تار ٹوٹا تھا مرے ساز کا، کچھ اور نہ تھا
جس کو اٹھ اٹھ کے ہر نغمہ سرا نے دیکھا

یوں وہ آنکھوں میں سمایا ہے کہ میں نے اُس کو
بارہا آئنہ داری کے بہانے دیکھا

ہم نے ایسے بھی کئی بار جلائے ہیں چراغ
جن کو دیکھا تو بس اِک موجِ ہوا نے دیکھا

وہ جو زنجیریِ نقشِ کفِ پا تھے تیرے
اُن کو مڑ مڑ کے بہت بانگِ درا نے دیکھا

○

تیرے غبارِ رہ میں دھڑکتا ہے اُن کا دِل
جو خاک ہو گئے ترے عزمِ سفر کے ساتھ

اے شمع! ایک تو ہی نہیں کشتۂ سحر
دل بھی بجھا بجھا ہے طلوعِ سحر کے ساتھ

چپ چاپ دیکھتے ہیں گزرتی بہار کو
کیا طاقتِ فغاں بھی گئی بال و پر کے ساتھ

○

غمِ حبیب! شکایت ہے زندگی سے مجھے
ترے بغیر بھی کٹتی رہی ' ذرا نہ رکی

عناں گسستہ چلی تھی تمہاری زُلفوں سے
گلوں نے لاکھ صدا دی مگر صبا نہ رُکی

○

اُس کو فراق پر، مجھے ملنے پہ ضد رہی
زورِ بیاں نے زورِ بیاں کو کتر دیا

اُس نے مثالِ مہرو ستارہ بیان کی
میں نے اسے حوالۂ شاخ و شجر دیا

مجھ کو بھی ظلمتوں سے نکالے گا ایک دِن
وہ، جس نے دستِ شب میں عصائے سحر دیا

○

ہزار شکر! سر شاخسار پھول کھلا
فغاں! کہ صحنِ گلستاں میں اِک کلی نہ رہی

تری گلی میں کوئی قسمت آزمائے کیا
کمند بام پہ پہنچی تو زندگی نہ رہی

○

ہنگامۂ زمانہ کی رونق اِسی سے ہے
قوس و خدنگ و صید بہم کر دیے گئے

کچھ تھے کہ جن کو ذوقِ اَلم دے دیا گیا
کچھ لوگ محوِ مشقِ ستم کر دیے گئے

گزرے کہاں ہیں دوست! زمانے وصال کے
اب وہ شبِ فراق میں ضم کر دیے گئے

○

فصلِ گل ہے، آ، لبوں پر رقص کر، اے زہر خند
ورنہ ہم پر تہمتِ آزردگی لگ جائے گی

اَوجِ معیارِ سخن کا ہے یہی عالم تو پھر
رفتہ رفتہ لب پہ مُہرِ خامشی لگ جائے گی

○

سفر دراز، نہ کوئی مکاں، نہ کوئی درخت
کوئی پناہ، نہ بارش کو روکنا بس میں

بھرے جہاں سے الگ ہو کے ہم کلام رہے
مدام، میں، مرا سایہ، اُداس، آپس میں

کسے ملے گی لرزتی لووں کی راہبری
کہاں رہی ہیں وہ بام و چراغ کی رسمیں

○

تمام عمر اکیلے میں تجھ سے باتیں کیں
تمام عمر ترے روبرو خموش رہے

تری صدا، تری بوئے قبا کی چاہت میں
ستم کشِ نفس و زیرِ بارِ گوش رہے

○

سحرِ شبِ مہ ٹوٹ گیا چاند کا کنگن
گرنے کو ہے اب ساعدِ سیمینِ سحر سے

دو گام پہ اب ختم ہوئی جاتی ہے دیوار
اب دیکھتے ہیں کون نکلتا ہے اُدھر سے

ہم تجھ سے گریزاں بھی اگر ہیں تو اِسی طور
جس طرح کوئی شاخ گریزاں ہو شجر سے

○

کون غرقاب ہوا ہے مجھے معلوم نہیں
ایک پیراہنِ رنگیں ہے لبِ جُو باقی

گُل بہر رنگ، بہر حال ہے مجبورِ سرشت
دستِ گلچیں میں بھی رہ جاتی ہے خوشبو باقی

○

تم بعدِ مرگ بھی اگر آؤ تو مرحبا
بازو سرِ صلیب، کشادہ رکھیں گے ہم

○

زمیں قاہر بھی ہے، ظالم بھی ہے اور بے اماں بھی ہے
پرندوں کے جسد بھی خاک میں آسودہ دیکھے ہیں

○

کوئی تیشہ تو چلا، کوئی شرارہ تو نکال
مدتیں بیت گئیں سوچ کو پتھرائے ہوئے

○

کچھ بے حسی بھی چاہیئے بہر سکونِ دل،
ہر لرزشِ صبا کے کہے پر نہ جایئے

○

چوما کسی گُل کو نہ کسی خار سے الجھا
بعد اپنے، چمن میں مری بیگانہ روی دیکھ

○

ہائے وہ ساعتِ خوں گشتہ کہ تو پیشِ نظر
تھا، مگر بہرِ تکلّم کوئی تقریب نہ تھی

○

راستے اور بھی تھے تیری گلی تک لیکن
ہم کو وحشت کے کڑے کوس پسند آئے ہیں

○

نقش و نگارِ بحر کو چشمِ حباب ہو کے دیکھ
آخری بار شہر کو پا بہ رکاب ہو کے دیکھ

○

زمین سخت ہے اور رہبری ہے میرے سپرد
لہو میں پاؤں ڈبو لوں تو نقشِ پا ابھرے

○

نکل گیا تھا سرِ شام کارواں تیرا
تمام شب ترے نقشِ قدم سے بات رہی

○

پھوڑ لیں سر بھی تو دنیا کا معمّا نہ کھلے
جیسے دیوار پہ تصویر ہو دروازے کی

○

اُس ایک نظر سے ہے اب تک کی غزل خوانی
سو رنگ سے بنتی ہیں اک زخم کی تصویریں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
سرابوں کے صدف

گردِ صحرا کے ہدف ہیں، ہم سرابوں کے صدف
ہم پہ دو آنسو بہا اے ابرِ نیساں ایک دِن

سرابوں کے صدف

خورشید رضوی

والدہ صاحبہ کے نام

ترتیب

نظمیں:

گزارشِ احوال

''شاخِ تنہا'' کے بعد یہ میرا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس کی اشاعت کی تحریک بھی میرے دوست جناب عبدالحمید چوہدری کی طرف سے ہوئی۔ ان کی سپاس گزاری میرا اولین خوشگوار فریضہ ہے۔ تاہم ان دنوں میں کچھ ایسی مصروفیات میں گھرا ہوا تھا کہ پرانے کاغذات کا جائزہ لینے اشعار کو یکجا نقل کرنے اور پھر انتخاب و ترتیب کے عمل سے گزرنے کیلئے میرے پاس وقت نہ تھا۔ اگر یہ کام میرے ذمے رہتا تو مسلسل التوا کا شکار ہوتا رہتا۔ میری اہلیہ نے یہ ساری مشقت اپنے ذمے لے کر اسے کمال حسن و خوبی سے نبھایا اور دس پندرہ روز کے اندر اندر پورا مسودہ اپنے سامنے پا کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ میرے بیٹے عامر نے بھی اس کام میں کچھ ہاتھ بٹایا۔ میں ان دونوں کا از حد ممنون ہوں

اس مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی، جن میں ''شاخِ تنہا'' سے پہلے کی کاوشیں بھی شامل ہیں۔ تاہم مجموعے کی ترتیب میں ترتیبِ زمانی کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ نظموں کا آخری حصہ ان تاثرات پر مشتمل ہے جو کائنات کی جابر حقیقت، موت، انسانی دل و دماغ پر مرتب کرتی ہے۔ یہ نوحے کسی بھی موت پر کسی بھی انسان کے تاثرات ہو سکتے ہیں۔ تاہم خاص میرے حوالے سے یہ جن صدموں کے آئینہ دار ہیں ان کی مختصر سی صراحت بھی نامناسب نہ ہوگی۔

''اکیس اپریل'' کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اور یہ نوحہ ہے بھی نہیں، بلکہ تسخیرِ مرگ کی ایک مثال ہے

قاضی عبدالنبی کوکب جواں سال ہونے کے باوصف، دینی حلقوں میں بڑے ثقہ قسم کے عالم دین تھے، لیکن میرے لیے وہ ایک بے تکلف دوست کی حیثیت رکھتے تھے۔ عربی فارسی کے عالم، ادب کے خوش ذوق قاری، خود ایک خوش فکر شاعر اور سب سے بڑھ کر، ایک نہایت درد مند انسان۔ مسلسل بیس برس کے لگ بھگ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے ایک خاموش گوشے میں بیٹھ کر وہاں کے عربی فارسی مخطوطات پر تحقیق کی اور ان کی ایک تفصیلی فہرست شائع کی۔ اور بھی بہت سی تصانیف ان کے قلم سے یادگار ہیں۔ آخر میں وہ اورینٹل کالج میں عربی کے استاد ہو گئے تھے، اور یہ ان کے علم و فضل کا صحیح مصرف تھا۔ لیکن 19 جنوری 1978ء کو سڑک پار کرتے کرتے وہ عرصۂ حیات ہی کو پار کر گئے۔

سلیم بے تاب "لمحوں کی زنجیر" کے مصنف، فیصل آباد کے معروف جواں سال شاعر لاہور سے گھر آنے کیلئے ویگن پر سوار ہوئے لیکن آسمانوں کا سفر راہ میں آن پڑا۔ میری ان سے دو چار مختصر سی ملاقاتیں تھیں لیکن میں ان کی سادہ و پر خلوص شخصیت کو فراموش نہیں کر سکا۔

"ایک اچانک موت کا نوحہ" اور "ایک پیدل چلنے والے دوست کا نوحہ" سید ظہیر الحق ساقی الحسینی سے متعلق ہیں۔ وہ میرے رفیقِ کار تھے۔ ایسے صاحب علم، غیور، وضعدار اور عالی ظرف انسان بہت کم میری نگاہ سے گزرے ہیں۔

میری والدہ کو شعر سے ایک فطری اور بہت گہرا لگاؤ ہے۔ وہ بتایا کرتی ہیں کہ اوائلِ عمر ہی سے ان کی یہ خواہش رہی ہے کہ ان کے اپنے گھر میں بھی کوئی فرد شعر کہنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس اعتبار سے میری شعری کاوشیں ان کی دیرینہ آرزو کی تکمیل کی ایک صورت ہیں۔ میں نے اس مجموعے کا انتساب انہی کے نام کیا ہے اور اس کا اختتام ان کے اور اپنے ایک مشترکہ دکھ پر کیا ہے کہ اس حوالے سے وہ میرے اس ہدیے کو اپنے دل کے قریب محسوس کر سکیں گی۔ میری مراد آخری دو نوحوں سے ہے جو میری مرحومہ خالہ کی اچانک وفات کا بے ساختہ ردعمل ہیں۔

جناب ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی قیمتی رائے سے نوازا اور حافظ محمد سعید صاحب کا دوستانہ تعاون مجھے حاصل رہا۔ میں ان دونوں حضرات کا تہ دل سے سپاس گزار ہوں۔

مجموعے کی ترتیب اگر چہ بڑی تیزی سے عمل میں آ گئی تھی تاہم اس نوع کے کاموں

میں ''وے افتاد مشکل ہا'' کا مرحلہ ہمارے ہاں قریب قریب ناگزیر ہے۔ ڈیڑھ سال کے قریب مختلف وجوہ سے مختلف مراحل پر یہ کام معلق رہا' تا آنکہ محمد حسن واسطی صاحب اس کی اشاعت کے خیال کو ایک حقیقت میں تبدیل کر سکے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء

خورشید رضوی

بارِ دگر

''سرابوں کے صدف'' ۱۹۹۵ء میں دوسری بار شائع ہوئی اور اب ایک عرصے سے دستیاب نہیں۔ تیسری کے بعد اب یہ اشاعت برادرِ عزیز صفدر حسین صاحب کی توجہ اور اہتمام کے نتیجے میں آپ کے سامنے آ رہی ہے۔ میں ان کا ممنون اور اُن کے لئے دعا گو ہوں۔

خورشید رضوی

مناجات

کتنا اِحسان ہے تیرا' یہ عنایت کرنا
تجھ کو منظور ہوا مجھ سے محبت کرنا

حسرتوں کا بھی کوئی روزِ جزا ہے کہ نہیں
میری حسرت میں تو تھا تیری اطاعت کرنا

حق نہیں ہے نہ سہی تیری سخاوت کے حضور
ہے مرا کام تمنا کی جسارت کرنا

جسم زندانِ عناصر میں گرفتار سہی
تو بہر حال مرے دل پہ حکومت کرنا

بوند ہوں کامِ صدف تک مجھے پہنچا دینا
شورشِ موج میں خود میری حفاظت کرنا

دل کو دریوزۂ کثرت میں نہ اُلجھا دینا
مجھ کو ہر سانس میں تنہا تو کفایت کرنا

نعت

شان اُنؐ کی سوچیے اور سوچ میں کھو جایئے
نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہو جایئے

سونپ دیجے دیدۂ تر کو زباں کی حسرتیں
اور اِس عالم میں جتنا بَن پڑے رو جایئے

یا حصارِ لفظ سے باہر زمینِ شعر میں
ہو سکے تو سرد آہوں کے شجر بو جایئے

اے زہے قسمت کسی دِن خواب میں پیشِ حضورؐ
فرطِ شادی سے ہمیشہ کے لئے سو جایئے

اے زہے قسمت اگر دشتِ جہاں میں آپؐ کے
نقشِ پا پر چلتے چلتے نقشِ پا ہو جایئے

غزلیں

○

نام ایسا ہے ترا، جب بھی زباں پر آئے
دل میں اِک خنجرِ تصدیق اترتا جائے

زندگی دُھوپ بڑھانے لگی آئینوں سے
میں چلا جب تری دیوار کے سائے سائے

اے صبا! میں تری تاثیرِ نفس تب جانوں
جب کسی دِن مرے ماتھے کی گرہ کھل جائے

میں زمیں پر ہی رہوں اور اُفق سے جھک کر
آسماں آپ مجھے ہاتھ لگانے آئے

غنچہ خاموش تھا جب تک، تو مہک اُس کی تھی
اب ہوا کی ہے، جہاں چاہے وہاں پھیلائے

تھی یہاں تو وہی پانی کی تجارت اچھی
آنکھ سے کس نے کہا تھا کہ لہو برسائے

جمع احباب ہوئے وقت کو زنجیر کرو
عمر کٹ جائے، یہ لمحہ نہ گزرنے پائے

○

نبضِ ایّام ترے کھوج میں چلنا چاہے
وقت خود شیشۂ ساعت سے نکلنا چاہے

دستکیں دیتا ہے پیہم مری شریانوں میں
ایک چشمہ کہ جو پتھر سے ابلنا چاہے

مجھ کو منظور ہے وہ سلسلۂ سنگِ گراں
کوہکن مجھ سے اگر وقت بدلنا چاہے

تھم گیا آ کے دمِ باز پسیں، لب پہ وہ نام
دل یہ موتی نہ اُگلنا نہ نگلنا چاہے

ہم تو اے دورِ زماں خاک کے ذرّے ٹھہرے
تو تو پھولوں کو بھی قدموں میں مسلنا چاہے

کہہ رہی ہے یہ زمستاں کی شبِ چار دہم
کوئی پروانہ جو اِس آگ میں جلنا چاہے

عمر اِسی کی ٹھوکریں کھانے کے عمل میں گزری
جس طرح سنگ ڈھلانوں پہ سنبھلنا چاہے

صبح دم جس نے اُچھالا تھا فضا میں خورشید
دل سرِ شام اُسی بام پہ ڈھلنا چاہے

○

مجھ کو پیہم دل کے گہرے سلسلوں پر سوچنا
آدمی سے آدمی کے رابطوں پر سوچنا

عطر کیسے ہو رہا ہے خاکِ تیرہ سے کشید
کُنجِ گُل میں بیٹھنا اور خوشبوؤں پر سوچنا

رنگ آمیزی ہوا میں تتلیوں کی دیکھنا
دور تک ان سُو بہ سو اُڑتے گُلوں پر سوچنا

آسماں پر آتی جاتی بدلیوں کو دیکھ کر
اپنے اندر سے گزرتے بادلوں پر سوچنا

دوستوں کی آنکھ سے بہتی نمی کو پونچھ کر
اپنی نس نس میں مچلتے آنسوؤں پر سوچنا

کوئی کر پائے تو ہے یہ بھی بڑی ہمت کا کام
مرقدوں پر بیٹھ کر گزرے ہوؤں پر سوچنا

دل کی وادی سے ورے سیلِ سماعت روک کر
جلوتوں کی ہاؤ و ہو میں خلوتوں پر سوچنا

زیست کے بنتے بگڑتے مسئلوں کے درمیاں
دل کو جو درپیش ہیں اُن مرحلوں پر سوچنا

مختصر ہے کس قدر خورشیدؔ میری سرگزشت
ناقصوں کی صحبتیں اور کاملوں پر سوچنا

○

جسم کی چوکھٹ پہ خم دل کی جبیں کر دی گئی
آسماں کی چیز کیوں صرفِ زمیں کر دی گئی

میرے ہاتھوں کی لکیروں ہی میں خم رکھا گیا
میری اُفتادِ طبیعت ہی غمیں کر دی گئی

کل مری بے خواب آنکھوں کے مقابل رات بھر
نقش تاروں میں وہ چشمِ سرمگیں کر دی گئی

خون رُلواتی رہی گزرے زمانوں کی شبیہ
تھک گئیں آنکھیں تو غرقِ ساتگیں کر دی گئی

کھوٹ سونے کے تسلسل میں کہیں آئی ضرور
یوں عبث تو سعی دِل باطل نہیں کر دی گئی

تلخ کر لیتا ہوں ہر لذت کی شیرینی کو میں
کیوں نگہ میری نگاہِ پیش بیں کر دی گئی

نقش، آخر دِل سے اُس رُوئے حسیں کا مٹ گیا
ختم آخر صحبتِ نام و نگیں کر دی گئی

○

پلکوں پہ اُس دیار کی مٹی اُٹھاؤں میں
آنکھوں سے اُس کی خاکِ قدم کو لگاؤں میں

یہ بات کیا ہوئی کہ جسے زندگی کہوں
جب جان پر بنے تو اُسے بھول جاؤں میں

کوہِ گراں ہوں مجھ کو اگر آزمائے تو
ریگِ رواں ہوں خود کو اگر آزماؤں میں

کہتا ہے آئنہ کہ کبھی میرے رُو برو
آئے تو تجھ کو تیری شکستیں گناؤں میں

میں اِس لیے نہیں کہ تجھے شادماں رکھوں
میری عطا یہ ہے کہ ترا دِل دُکھاؤں میں

بو جاؤں سچ کے زہر کی تلخی کا ذائقہ
جب اُس میں پھل لگے تو تجھے یاد آؤں میں

میرے کہے کو یاد کرے اور رو پڑے
دِل میں ترے وہ پھانس لگی چھوڑ جاؤں میں

یہ دشتِ بے کسی ہی سہی پھر بھی اے جنوں
جو تجھ سے اُٹھ سکے وہ قیامت اُٹھاؤں میں

اے روشنیِ طبع بہت بے اماں ہے تو
کن جنگلوں میں تیرے شرارے اُڑاؤں میں

بولوں تو بازگشت برابر کا دے جواب
ایسا پہاڑ ہو تو غمِ دل سناؤں میں

عمرِ گریز پا مجھے اتنا تو دے فراغ
جو کچھ کہ جاننا تھا یہاں، جان جاؤں میں

ہاں میرے غم میں خود کو خزاں کر لے اے بہار
شاید کہ اب چمن میں پلٹ کر نہ آؤں میں

وہ کوکبِ☆ سحر کہ جو مٹی میں جا ملا
خورشید اب کہاں سے اُسے ڈھونڈ لاؤں میں

☆ عبدالنبی کوکب (مرحوم)

○

ابھی لبوں پہ نہیں، ہے جو روشنی دِل میں
ترش رہی ہے ابھی لفظ کی کنی دِل میں

کوئی نہیں ہے جو اِن سیپیوں کو کھول سکے
پڑے ہیں لاکھ سخن ہائے گفتنی دِل میں

یہ مجھ سے برسرِ پیکار خلوتوں میں مری
چھپا ہے کون یہ تلوار کا دھنی دِل میں

فغاں، کہ ٹال گئے ہم وہ ایک فرصتِ مرگ
تمام عمر رہی جس کی جانکنی دِل میں

سرابِ علم و ہنر پر نہ بھولنا خورشیدؔ
جس آدمی کے نہ دیکھو فروتنی دِل میں

○

دل کی خلوت سے زباں تک کا سفر کس نے کیا
درد کے عکسِ گریزاں کو امر کس نے کیا

مسکرا کر زخم کھانے کی بنا کس نے رکھی
تلخیوں کو زیست سے شیر و شکر کس نے کیا

تم نے یا ہم نے لکھے پیغام فصلِ گل کے نام
خوشبوؤں کو گلستاں میں نامہ بر کس نے کیا

کیا یہ اِس بے دست و پا اندھے صدف کا کام ہے
بوند کو پانی کی ظلمت میں گہر کس نے کیا

کس نے ماہِ نو کی ڈالی پاؤں میں بیڑی مرے
شام کے منظر کو میرا ہم سفر کس نے کیا

پیڑ کو کس نے ہلایا ہے کہ اُڑتے ہیں پرند
ذہن میں ٹھہرے ہوؤں کو در بدر کس نے کیا

زلزلوں نے یا جبیں گھستے ہوئے سیلاب نے
رفتہ رفتہ گھر کی بنیادوں میں گھر کس نے کیا

کس نے چھوڑا آسماں تک لا کے پتھر کی طرح
میں پرندہ تھا مجھے بے بال و پر کس نے کیا

○

پھر وہ گم گشتہ حوالے مجھے واپس کر دے
وہ شب و روز وہ رشتے مجھے واپس کر دے

آنکھ سے دل نے کہا رنگِ جہاں شوق سے دیکھ
میرے دیکھے ہوئے سپنے مجھے واپس کر دے

میں تجھے دوں تری پانی کی لکھی تحریریں
تو وہ خونناب نوشتے مجھے واپس کر دے

میں شب و روز کا حاصل اُسے لوٹا دوں گا
وقت اگر میرے کھلونے مجھے واپس کر دے

مجھ سے لے لے صدف و گوہر و مرجاں کا حساب
اور وہ غرقاب سفینے مجھے واپس کر دے

نسخۂ مرہمِ اکسیر بتانے والے
تو مرا زخم تو پہلے مجھے واپس کر دے

ہاتھ پر خاکۂ تقدیر بنانے والے
یوں تہی دست نہ در سے مجھے واپس کر دے

آسماں! صبح کے آثار سے پہلے پہلے
میری قسمت کے ستارے مجھے واپس کر دے

میں تری عمرِ گزشتہ کی صدا ہوں خورشیدؔ
اپنے ناکام ارادے مجھے واپس کر دے

○

نشانِ آب تو کیسا، سراب تک نہ دیا
وصال کیا، شرفِ انتساب تک نہ دیا

نہ جانے حسرتِ خوش فہم کس خیال میں ہے
وگرنہ اُس نے حسیں کوئی خواب تک نہ دیا

اُسے خبر بھی نہیں اور دل میں بستا ہے
وہ اجنبی جسے خط کا جواب تک نہ دیا

خود اپنے آپ میں گھُٹ گھُٹ کے مر گئی خوشبو
صبا کو سنگ نے رستہ گلاب تک نہ دیا

نگاہِ یار سے خوں کا قصاص کیا لیتے
نگاہِ یار نے خوں کا حساب تک نہ دیا

سحر تو خیر کہاں، تیرگی تو پھیکی ہو
فلک نے مہر کجا، ماہتاب تک نہ دیا

سمندروں سے وہ شبنم بھی اُٹھ گئی خورشیدؔ
کہ تشنگاں کو کسی نے حباب تک نہ دیا

○

بھریں نہ وقت کے ہاتھوں جراحتیں تیری
رکھیں سنبھال کے دل نے امانتیں تیری

چھپا کے تجھ سے کہاں اپنے روز شب لے جاؤں
جہانِ نور ترا، اور ظلمتیں تیری

بچھڑ کے تجھ سے ملا عمر بھر کا سناٹا
بنا گئیں مجھے تنہا، رفاقتیں تیری

تو ہے وہ فاتحِ عالم کہ ایک دُنیا نے
شکست کھا کے سراہی ہیں ہمتیں تیری

ترے نقوشِ قدم سے بہار تھی اِن کی
ہیں منتظر مرے دل کی مسافتیں تیری

کہاں ہے شامِ تمنا! ملاحتوں کا وہ رنگ
کہاں ہیں صبحِ تصور! صباحتیں تیری

دلِ حزیں! تری چوکھٹ پہ عمر کون گنوائے
کبھی سمجھ میں نہ آئیں ضرورتیں تیری

ازل سے شیشۂ گردوں میں ریت چلتی ہے
کبھی شمار میں آئیں نہ ساعتیں تیری

تو میری شرکتِ ہستی کہیں قبول تو کر
تمام رنج مرے، سب مسرتیں تیری

Scanned by CamScanner

○
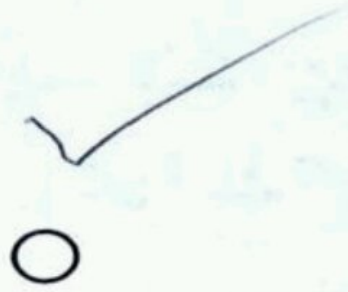
بساطِ وقت پہ صدیوں کے فاصلے ہم لوگ
کنارِ شام و سحر میں کہاں ڈھلے ہم لوگ

نہ کارواں نہ مسافر مگر جرس نہ تھمی
نہ روشنی نہ حرارت مگر جلے ہم لوگ

مقام جن کا مؤرّخ کے حافظے میں نہیں
شکست و فتح کے مابین مرحلے ہم لوگ

نمودِ جسم کی شوریدہ خواہشیں دنیا
فشارِ رُوح کے نادیدہ ولولے ہم لوگ

نہ جانے کب کوئی کروٹ ہمیں جگا ڈالے
زمیں کے بطن میں خوابیدہ زلزلے ہم لوگ

فسادِ کوہکنی ' حیلہ ہائے پرویزی
ہزار رنگ کے کانٹوں میں آبلے ہم لوگ

امیرِ شہر کی موٹی سمجھ میں کیا آتے
ضمیرِ دہر کے نازک معاملے ہم لوگ

ہجومِ سنگِ اذّیت میں سر جھکائے ہوئے
رواں ہیں لے کے مشیت کے قافلے ہم لوگ

زباں بریدہ و بے دست و پا سہی لیکن
ضمیرِ کون و مکاں ہیں برے بھلے ہم لوگ

○

کوئی زمانہ بھی ہو، دکھ یہی ہیں ہونے کے
ملیں گے خاک میں، ہوں لاکھ آپ سونے کے

حباب ہوں مرا مسکن ہی سطحِ آب پہ ہے
مجھے تو سات سمندر نہیں ڈبونے کے

مری سرشت میں تھی زندگی سے بیزاری
ترے ستم تو بہانے تھے ہاتھ دھونے کے

اِدھر یہ کانپتے ہاتھ اور یہ ڈگمگاتے قدم
اُدھر وہ دل کے عزائم پہاڑ ڈھونے کے

نہ بھولتے ہیں وہ منظر، نہ یاد آتے ہیں
عجیب تھے وہ سفر جاگتے میں سونے کے

یہی زمیں ہے تو پھر فصل کاٹنا کیسا
کٹیں گے ہاتھ گنہگار بیج بونے کے

نئے علوم خلاؤں میں راج کر لیں گے
مگر یہ دِل کے سمندر نہیں بلونے کے

○

وہی ہے آنکھ، وہی شب ہے، خواب بدلا ہے
مٹا کہاں ہے ابھی اضطراب، بدلا ہے

نشہ فراق کا برسوں میں جا کے راس آیا
کشاں کشاں مرا ذوقِ شراب بدلا ہے

بدل گیا ہے زمانہ بہت، پہ کیا بدلا
یہی کہ حدِّ نظر پر سراب بدلا ہے

اِسے کبھی، کسی کروٹ، نہ مل سکا آرام
سدا عذاب سے دل نے عذاب بدلا ہے

پلٹ پلٹ کے نئی اپنی باز گشت آئی
سوال کا مرے پیہم جواب بدلا ہے

بدل رہا ہے زمانہ لباس بے آہٹ
کہ دستِ شاخ میں جیسے گلاب بدلا ہے

حیات و موت ہماری نظر میں کچھ بھی نہیں
بس اِس قدر کہ ہوا نے حباب بدلا ہے

○

غم و سرور زمانے پہ کارگر کیا ہے
بہت بسے، بہت اُجڑے مگر اثر کیا ہے

میں چلتا جاتا ہوں تحلیل ہوتا جاتا ہوں
کڑکتی دھوپ میں شبنم کا یہ سفر کیا ہے

زمین ہوں تو خزانے کہاں گئے میرے
درخت ہوں تو مری شاخ کا ثمر کیا ہے

ہزار آئنوں میں جیسے اِک کرن محبوس
نظر ہی کیا ہے مری، نقطۂ نظر کیا ہے

وہ آگ ہے کہ جو اُڑتا ہے جل کے گرتا ہے
فضا کا روگ ہے تقصیرِ بال و پر کیا ہے

○

اپنے باطن کے چمن زار کو رجعت کر جا
دیکھ اب بھی روشِ دہر سے وحشت کر جا

اپنا چلتا ہوا بُت چھوڑ زمانے کے لئے
اور خود عرصۂ ایّام سے ہجرت کر جا

مانتا جس کو نہ ہو دل وہ عمل خود پہ گزار
جو فسانہ ہو اُسے چھو کے حقیقت کر جا

سر کٹایا نہیں جاتا ہے، تو کٹ جاتا ہے
بات اِتنی ہے کہ اِس کام میں سبقت کر جا

جاں سے آگے بھی بہت روشنیاں ہیں خورشید
اک ذرا جاں سے گزر جانے کی ہمت کر جا

○

بے بسی اِس کو کہیں، یا کہیں ذوقِ ایثار
اپنی دھڑکن کو نمایاں نہیں کرتا دلِ زار

زیست کے چار طرف سنگِ خموشی کی فصیل
کسی جانب نہیں کھلتا کوئی بابِ اظہار

لڑکیاں قید ہیں سیلی ہوئی دیواروں میں
شاہزادہ کوئی آیا نہ کوئی شاہسوار

مکڑیاں تان کے بیٹھی رہیں روزنِ دل کے
کوئی سورج کی کرن اِن سے نہ گزری زنہار

گونج کا زنگ لگا جاتا ہے محرابوں کو
لوٹ لوٹ آتی ہے محرومِ سماعت گفتار

ہے وہی طوقِ گلو اور وہی زنجیرِ قدم
اور اُسی قوسِ مکرّر پہ رواں ہے پرکار

جانے اِس حبس میں کب موجِ ہوا نقب لگائے
جانے کب میان کی ظلمت سے رہا ہو تلوار

○

ہوائے بے طرب و فصلِ بے ثمر گزری
ترے بغیر گزرنا ہی کیا، مگر گزری

شریکِ شورشِ دنیا ہوں اور سوچتا ہوں
کہ شمع بزمِ طرب سے بھی چشم تر گزری

نہ تھی پہاڑ سے کچھ کم مگر مصیبتِ عمر
ترے خیال میں گزری تو مختصر گزری

کوئی بھی کام نہ آیا شکستہ بالی میں
صبا بھی شاخِ نشیمن کو کاٹ کر گزری

مری نگاہ نے خوابوں میں خود کو پہچانا
کہ جاگتے میں جو گزری وہ بے بصر گزری

زمانے بھر سے الگ ہو کے میں اُدھر کو چلا
جدھر جدھر سے مرے دل کی رہ گزر گزری

○

کنجِ لب و رخسار و دہن بھی ہے بڑی چیز
ظاہر کے مظاہر کی پھبن بھی ہے بڑی چیز

ہر سانس ترے قرب کی لذت سے ہے سرشار
اب روح نے مانا کہ بدن بھی ہے بڑی چیز

کچھ گل ہی پہ موقوف نہیں سحرِ بہاراں
مہکی ہوئی یہ خاکِ چمن بھی ہے بڑی چیز

اخلاص ترے دل میں نہیں بھی ہے تو کیا ہے
ملنے کا یہ بے ساختہ پن بھی ہے بڑی چیز

ہر چند ترے روپ کا اک عکس ہے لیکن
اے دوست مرا رنگِ سخن بھی ہے بڑی چیز

○

مسافت کٹ چکی کب کی، مگر درپیش ہے دِل کو
سفر کے بعد اب یادِ سفر درپیش ہے دِل کو

قدم گو کارواں کے ساتھ ہیں پامال راہوں پر
مگر سب سے الگ اِک رہ گزر درپیش ہے دِل کو

نہ کر دیں نیم شب سے نیم جاں بے تابیاں اپنی
سوادِ شام سے شوقِ سحر درپیش ہے دِل کو

وہ منظر ایک لمحے کو رُکا پیشِ نظر لیکن
وہ اک لمحہ جو تھا اب عمر بھر درپیش ہے دِل کو

ہمیں جانے کہاں لے جائے گی آوارگی اِس کی
ہوا کی راہ، بادل کا سفر درپیش ہے دِل کو

○

دل پر اثرِ دو حرفِ سادہ
افسون و طلسم سے زیادہ

دیکھا جو تجھے تو ہو گیا موم
پتھر پہ لکھا ہوا اِرادہ

دِل اُس کی طلب میں دشت دردشت
دن رات، عبث ہے پر کشادہ

واپس نہ کبھی پلٹ کے آیا
لمحہ، شطرنج کا پیادہ

بے صرفہ ہیں منتشر جہاں میں
بے بادہ و جام، جام و بادہ

ہے کوئی کہیں، کوئی کہیں ہے
دشوار ہے ربط و اِستفادہ

ہیں صاحبِ عزم رہنِ آلام
جو چین سے ہیں وہ بے اِرادہ

القصہ ہے تار تار ہر سو
بکھرا ہوا زیست کا لبادہ

اُمید ہے اور رُو برو ہے
اِک لشکرِ بیم اِیستادہ

خورشید ہے اور شرق تا غرب
پھیلا ہوا آسماں کا جادہ

○

دل وقفِ جراحت ہے، مگر رو نہیں سکتے
دامن میں بہت بیج ہیں پر بو نہیں سکتے

کیا خوفِ زیاں اُن کو جو خود کھوئے گئے ہوں
اب اِس سے سوا اور تو کچھ کھو نہیں سکتے

اِس دَور میں وہ لوگ کہاں جائیں خدایا
جو کانِ نمک میں بھی نمک ہو نہیں سکتے

ہر شخص کے ہاتھوں پہ ہیں پتھر کی لکیریں
جو کچھ کہ ہوا نقشِ جبیں دھو نہیں سکتے

خورشیدؔ ہے سرتا بہ قدم زخم و لیکن
ہم چھوڑ بھی اِس شخص حزیں کو نہیں سکتے

○

بن میں جب آئے تو اپنی چاپ سے ڈرتے تھے ہم
شہر میں رہ کر بنوں کی آرزو کرتے تھے ہم

اب فرشتوں سے بھی مل کر سوئے ظن جاتا نہیں
خوب تھے وہ دن کہ اِک انساں کا دم بھرتے تھے ہم

رُوح سے مربوط تھا اُس کی صدا کا زیر و بم
پے بہ پے جیتے تھے ہم اور دَم بہ دَم مرتے تھے ہم

خوب تھے وہ دن کہ تھا وجہِ خود آزاری خلوص
دُوسروں کی تہمتیں بھی اپنے سر دھرتے تھے ہم

اَب کبھی سوچیں تو خود کو بھی یقیں آتا نہیں
اُس سنہرے دور میں کیا کیا، کیا کرتے تھے ہم

○

مژہ سے اشک ڈھلیں، دل میں حسرتیں جاگیں
اِدھر سے گزروں تو سوئی محبتیں جاگیں

شکستِ دل کی صدا پے بہ پے سنائی دے
مٹی مٹی سی خیالوں میں صورتیں جاگیں

کتابِ درد کی گم کردہ آیتیں اُتریں
جہانِ شوق کی بھولی رِوایتیں جاگیں

یہی ہے ترکِ محبت؟ کہ ایک عمر کے بعد
ملے وہ اب بھی تو دِل میں شکایتیں جاگیں

ہے تیری یاد وہ آئینۂ رُو برو جس کے
ہزار سال کی کھوئی رفاقتیں جاگیں

وہ سرکشیدہ چٹانیں، وہ چاندنی وہ سکوت
کہ دِل کی چاپ سے سینے میں ہیبتیں جاگیں

کبھی ملو تو چلیں پھر اُنہی پہاڑوں میں
کہ پتھروں پہ پرانی عبارتیں جاگیں

○

سراغِ عمرِ رفتہ پا کے روئیں
پرانے راستوں پر جا کے روئیں

سہارا دے اگر کوئی تو ہم بھی
ہجومِ درد سے گھبرا کے روئیں

کسی دن اہلِ دُنیا سے بہت دُور
خدا کے بازوؤں میں جا کے روئیں

ہر اِک آغاز پر سو خواب دیکھیں
ہر اِک انجام پر پچھتا کے روئیں

نوا ڈوبی ہوئی ہو سوزِ دِل میں
عزیزوں کو لہو رُلوا کے روئیں

بہت دِن سے یہ حسرت ہے کہ خورشیدؔ
کسی دِن خود کو تنہا پا کے روئیں

○

سب سخن میں بھی نہ سمٹیں گے خزینے دِل کے
دفن دِل ہی میں رہیں گے یہ دفینے دِل کے

غرفۂ جاں میں دوبارہ کوئی آیا نہ گیا
ایک آہٹ کو ترستے رہے زِینے دِل کے

یہ سیہ رات، یہ وحشت کدۂ تنہائی!
اور یہ آسیب کے مانند قرینے دِل کے

ایک چاپ، ایک صدا، ایک حنائی دستک
اور پٹ کھول دیے اُٹھ کے کسی نے دِل کے

غمِ دُنیا، غمِ دیں، عشق و ہوس، جذب و خرد
ہر سمندر میں ہیں دو چار سفینے دِل کے

کیا قیامت ہے کہ وہ بھی تری تصویر نہیں
جس پہ اِک عمر لگے خون پسینے دِل کے

دستِ بیدادِ زمانہ سے بس اِتنی ہے طلب
قتل کر لے مگر انداز نہ چھینے دِل کے

لے کے آیا ہوں ترے پاس فقط گردو غبار
رنگ سب چھین لیے دربدری نے دِل کے

میرا معیارِ سخن تیری پذیرائی ہے
تو نہ پہنے تو ہیں جھوٹے یہ نگینے دِل کے

○

لوگ کیا بن جائیں، باطن کا کہا مانیں اگر
معجزے ہو جائیں، جی میں معجزے ٹھانیں اگر

ہم ہیں اِس گھر میں تو اِس کو پوچھتا کوئی نہیں
اِک جہاں ٹوٹے یہاں سونے کی ہوں کانیں اگر

حسبِ حال اِک خامشی تصویر خانے میں رہے
خوب ہو مٹّی کے پُتلوں میں نہ ہوں جانیں اگر

خاکساری پر ہیں کیا کیا اہلِ دُنیا کے سلوک
کیا قیامت ہو، ہم اپنی قدر پہچانیں اگر

اہلِ دل اہلِ جہاں کے غم میں ہیں کیوں دل فگار
میں اِنہیں درسِ خموشی دُوں، مری مانیں اگر

ہیں یہی منصف تو میرے قتل ہو جانے کے بعد
کیا تعجب ہے مجھے قاتل بھی گردانیں اگر

ہے رَوا خورشیدؔ اُن کھوئے خزانوں کے لیے
ہم سرِ گورِ غریباں خاک بھی چھانیں اگر

○

ظاہر میں سرِ دہر سبک سر بھی رہے ہم
پر باطنِ ایّام کو ازبر بھی رہے ہم

تو لاکھ گریزاں تھی، پر اے عمرِ گریزاں
الزامِ مجسم تھے ترے سر بھی رہے ہم

پھولوں کی طرح شاخ سے پھوٹے بھی کئی بار
رنگوں کی طرح خاک میں مضمر بھی رہے ہم

خوشبو نہیں ٹھہری کوئی جلوت کی فضا میں
خلوت میں جو بیٹھے تو معطّر بھی رہے ہم

ڈھونڈا ہی کیے ہم کو، ہمیں دیکھنے والے
اندھوں کو شب و روز میسّر بھی رہے ہم

گوہر بھی کہا، چند شناساؤں نے ہم کو
اور جادۂ ایّام پہ پتھر بھی رہے ہم

خورشیدؔ! سرِ دار و رسن ہی سہی لیکن
اُس شوخ کے قامت کے برابر بھی رہے ہم

○

وہ دن جب ایک ایک روِش پہ سوسو روشن آنکھیں تھیں
اُس دن باغ کے اِک گوشے میں کیا من موہن آنکھیں تھیں

قید و سلاسل ہوتے تو ہم کب کے توڑ کے جا چکتے
قید وسلاسل کچھ بھی نہیں تھے پیار میں بندھن آنکھیں تھیں

اب تک، آنکھوں میں پھرتا ہے دن وہ تیری جدائی کا
پت جھڑ پت جھڑ دل کا آنگن ساون ساون آنکھیں تھیں

یاد ہے ہم کو وہ دِن جب ہم تیری گلی سے گزرے تھے
چلمن چلمن سرگوشی تھی، روزن روزن آنکھیں تھیں

لاکھ ادائیں پاؤں پڑیں ہم رُوپ نگر میں نہ ٹھہریں گے
کیا کیا جی میں ٹھانی تھی، پر ساتھ یہ بیرن آنکھیں تھیں

دست و گریباں تھیں ماتھے پر موجیں ظاہر و باطن کی
چہرے سکھ کا سوانگ رچائے دکھ کا درپن آنکھیں تھیں

کیا بتلائیں دیکھا ہم نے سپنے میں کل کیسا رُوپ
ایسا رُوپ کہ اِک دوجے کی بیرن سوکن آنکھیں تھیں

○

جدا جو تم سے نظر ایک پل ہوئی ہوتی
شبِ وصال میں کیا کیا غزل ہوئی ہوتی

جو پاؤں ٹوٹ گئے آ کے منزلوں کے قریب
اُنہی کے ساتھ تمنا بھی شل ہوئی ہوتی

دلِ تباہ کو حسرت سے دیکھنے والے
یہی نگاہ اگر برمحل ہوئی ہوتی

پہیلی زندہ ہے اِبہام کے وسیلے سے
کسی کو یاد نہ رہتی جو حل ہوئی ہوتی

نہ جانے آج تلک زندگی کا کیا ہوتا
وہ واردات اگر آج کل ہوئی ہوتی

شبِ فراق کی، کوتہ نصیبیاں خورشیدؔ
کسی کی زلفِ مسلسل کا بل ہوئی ہوتی

○

کچھ یقیں بھی آ چلا وہم و گماں کے ساتھ ساتھ
چل پڑی جوئے رواں، ریگِ رواں کے ساتھ ساتھ

نام لیتے ہی ترا، سینے میں سیلاب آ گیا
تو تہِ دِل میں بھی ہے نوکِ زباں کے ساتھ ساتھ

ڈوبنے دیں گے نہ اب اِس دِل نشیں مہتاب کو
ہم بھی گردش میں رہیں گے آسماں کے ساتھ ساتھ

بہ رہا ہے دِل کسی کاغذ کی ناؤ کی طرح
ہوں سرِ ساحل رواں، آبِ رواں کے ساتھ ساتھ

بڑھتا جاتا ہے مری انجام بینی کے سبب
خوفِ تنہائی ہجومِ دوستاں کے ساتھ ساتھ

دِل کی تنویریں کجا' لفظوں کی تصویریں کجا
کھل گیا عجزِ بیاں' طرزِ بیاں کے ساتھ ساتھ

جانے یہ اُلفت ہے یا بے اعتمادی ہے کہ لوگ
رات دِن پھرتے ہیں اپنے راز داں کے ساتھ ساتھ

ہو سکے خورشیدؔ تو کچھ یوں بسر کر جائیے
دِل خدا کے ساتھ ہو' پیکر جہاں کے ساتھ ساتھ

○

کون دیکھ پائے گا جوہرِ نہاں دِل کا
رائگاں ہی جائے گا گنجِ شائگاں دِل کا

رنگِ محفل ایسا ہے دل بھی کم دھڑکتا ہے
ورنہ یوں تو حق ٹھہرا نالہ و فغاں دِل کا

چار سمت استادہ' تن کی چاردیواری
اور اُس کے بیچوں بیچ ڈولتا مکاں دِل کا

اپنی رزمگہ میں دِل آپ مردِ میداں ہے
اور کون اُٹھاتا ہے قرعۂ گراں دِل کا

شش جہاتِ دُنیا دل کی کب سمائی تھی
اپنی اِک زمیں دِل کی' اپنا آسماں دِل کا

سوگوار لگتی ہے چشمِ سرگیں اُس کی
جیسے اُس کی چوکھٹ میں آ لگا دُھواں دِل کا

وقت اُڑتا جاتا ہے، زرد پڑتا جاتا ہے
شاخسارِ ماضی پر سبز آشیاں دِل کا

جو فقط دلائل کے تار و پود سے اُبھرے
اُس یقیں سے بہتر ہے دوستو، گماں دِل کا

ہیں خیال و خواب و خوں، سب طواف میں اِس کے
مثلِ سنگِ کعبہ ہے، سنگِ آستاں دِل کا

دل سے حرفِ حق اکثر پھوٹتا تو ہے لیکن
زور توڑ دیتی ہے لغزشِ زباں دِل کا

اب کہاں ہے سینوں میں وہ دفینۂ پر سوز
اب تو ایک تہمت ہے نامِ بے نشاں دِل کا

○

(بیادِ مجید امجد)

پلٹ کے صبح کا سورج تو روز آئے گا
مسافرِ ''شبِ رفتہ'' کبھی نہ پلٹے گا

اُسی کی دیکھتے ہیں راہ سب جو کہتا تھا
''میں جب اِدھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا''

وہ اِک درخت کہ تھا دوسروں پہ سایہ فگن
اب اُس کی طرح تمازت کو کون جھیلے گا

نظر پہ کس کی وہ اسرار منکشف ہوں گے
زباں سے کس کی لہو شعر بن کے ٹپکے گا

وہ لہجہ جس میں رچی تھیں مسافتیں لاکھوں
اب اُس تھکے تھکے لہجے میں کون بولے گا

وہ ایک نافہ کہ ہے آدمی کے باطن میں
اب انجمن میں گرہ اُس کی کون کھولے گا

غروبِ تابش امجدؔ کے بعد اب خورشیدؔ
کہاں وہ ذہن کہ جو اَن کہی کو سمجھے گا

○

(بیادِ مجید امجد)

ہوئے چمن میں مرے ترجماں گلاب کے پھول
لہو میں غرق، تبسّم کناں گلاب کے پھول

میں اِن کے ساتھ خزاں میں بکھرتا جاتا ہوں
اُڑا رہے ہیں مری دھجیاں گلاب کے پھول

جس انجمن میں کہ تھا کاغذی گلوں کا چلن
اُس انجمن میں جلے رائگاں گلاب کے پھول

ہمیں تو حسنِ نظر کا جنون ہے، ورنہ
کہاں یہ ریگِ رواں اور کہاں گلاب کے پھول

میں جانتا ہوں انہیں زخمِ تازہ کا فرمان
وہ بھیجتے ہیں مجھے ارمغاں گلاب کے پھول

کوئی سنے تو خموشی ہے گفتگو اِن کی
کہ صد زباں بھی ہیں یہ بے زباں گلاب کے پھول

دُعائیں کاوشِ امجد کو دیجیے خورشید
ہیں جس کے فیض سے نکہت فشاں گلاب کے پھول

ترے سخن میں رہے تا ابد گلوں کی مہک
''تری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول''

○

احساس کی تہوں میں جو موجِ قلق چلے
قرطاس پر زبانِ قلم ہو کے شق چلے

ہے دہر کی نہاد ہی سرگشتۂ رسوم
حق کو بھی ایک رسم بنائیں تو حق چلے

کب تک بچا بچا کے رکھوں اِک نگہ کی یاد
مانگے کی زندگی کی کہاں تک رمق چلے

اُس کے نقوشِ پائے حنا بستہ دیکھ کر
مٹی پہ آسماں سے اُتر کر شفق چلے

ہم جس کو پڑھ رہے ہیں دبستانِ عشق میں
فرہاد و قیس سے نہ وہ تازہ سبق چلے

مشکل ہے ضبطِ سیل سخن بسکہ دوستو
سی لوں اگر لبوں کو تو چھاتی تڑق چلے

جو لب پہ نیم شب تہِ دل سے نکل کے آئے
وہ بات سینہ سینہ ورق در ورق چلے

ہستی ندامتوں کے دو آبے میں ڈوب جائے
آنکھوں سے اشک اور جبیں سے عرق چلے

خورشیدؔ کہہ گزر یہ سخن گسترانہ بات
دیکھیں کسی سے گر یہ زمینِ ادق چلے

○

ملتا ہی نہیں درد کا پیکر کوئی مجھ سا
آئینے میں اِک شخص ہے کمتر کوئی مجھ سا

ایمان بھی تنہا ہے مرا کفر بھی تنہا
مومن کوئی مجھ سا ہے نہ کافر کوئی مجھ سا

ہے کون جو اِس ابر کے پردے میں رواں ہے
دیوانہ ہے دیوانہ سراسر کوئی مجھ سا

کہسار کے دامن میں ملاتا ہے نہاں کون
آواز سے آواز برابر کوئی مجھ سا

لینے نہیں دیتا کسی کروٹ مجھے آرام
اِک شخص، ہٹیلا، مرے اندر کوئی مجھ سا

میں ٹوٹتا تارا ہوں نظر مجھ سے ملا لو
پھر کاہے کو دیکھو گے مکرّر کوئی مجھ سا

آئینہ ہوں اور چہرۂ خورشیدؔ پہ وا ہوں
ہو گا کہیں قسمت کا سکندر کوئی مجھ سا

○

ہر چند انجمن میں ہوں، تنہائیوں میں ہوں
دو زور سے صدا کہ میں گہرائیوں میں ہوں

اب تک اُسی طلسمِ مکرّر میں قید ہوں
اب تک تری بنائی ہوئی کھائیوں میں ہوں

کوئی تو ہو کہ جو مرا شیرازہ بند ہو
بکھرا ہوا خیال کی پہنائیوں میں ہوں

مدّت کے بعد آئنے سے گرد جھاڑ کر
کچھ دِن سے اب خود اپنی پذیرائیوں میں ہوں

جب انجمن میں تھا تو میں تنہا تھا اور اب
تنہا ہوں اور انجمن آرائیوں میں ہوں

○

کچھ قطار اندر قطار ایسی ہوئی تو فیرِ گُل
پڑ گئی موجِ صبا کے پاؤں میں زنجیرِ گُل

رات پھر دِل میں ترا رُوئے حسیں تھا جلوہ ریز
شعلہ زن تھی سبزیِ اوراق میں تصویرِ گل

موجۂ بادِ صبا کی لوح، شبنم کے حروف
کس نزاکت سے مشیت نے لکھی تقدیرِ گل

بڑھ رہا ہے دم بہ دم ذوقِ جگر کاوی مرا
ہو رہی ہے شاخ کے اندر کہیں تعمیرِ گل

اہلِ گلشن کے شبستاں میں نہیں شعلے کو دخل
یا چراغِ کرمکِ شب تاب یا تنویرِ گل

○

ترک کریں لب کھولنا
چھوڑ دیں ہنسنا بولنا

دُنیا ساری بِس بھری
کیا اِس میں رس گھولنا

آنسو تو انمول ہے
آنسو کا کیا تولنا

تو ہے پری خیال کی
دِل ہے اُڑن کھٹولنا

اپنا بھی کیا کام ہے
لہجے میں خوں گھولنا

پھونک کے اپنے آپ کو
راکھ سے موتی رولنا

○

کھو گئی دُور کہیں بانگِ درا، ڈُھونڈ کے لائیں
دشتِ ماضی میں چلیں، اپنا پتا ڈُھونڈ کے لائیں

اب بھی صحرا میں ہو شاید وہ امانت باقی
وہی گم گشتہ نشانِ کفِ پا ڈُھونڈ کے لائیں

میں اُسے رُوٹھ کے جانے تو دُوں لیکن کیسے
جب ذرا اُٹھ کے چلا، دل نے کہا، ڈُھونڈ کے لائیں

ہاتھ ملتے ہوئے مٹی میں اَٹے لوٹ آئے
خاک ہی خاک ہے اِس خاک سے کیا ڈُھونڈ کے لائیں

تو اگر شکر کا رَب ہے تو پھر اے ربِّ کریم
کیا شکایت کو کوئی اور خدا ڈُھونڈ کے لائیں

تپشِ دہر میں سایہ نہیں ملتا کوئی
پھر وہی دوشِ محمدؐ کی رِدا ڈُھونڈ کے لائیں

نظمیں

نیلے پہاڑ

پھر بلاتے ہیں مجھے نیلے پہاڑ
دُور اُفق پر آسمانوں سے ملے
سبز پیڑوں کی قطاروں سے پرے
پا پیادہ گاؤں کی جانب رواں
سادہ دِل انجان بُڑھیا کی طرح
بادلوں کی گٹھریاں سر پر رکھے
پھر بلاتے ہیں مجھے نیلے پہاڑ

جانے کب قدموں کی زنجیریں کٹیں
جانے کب رستے کی دیواریں ہٹیں

قفل ٹوٹیں حاضر و موجود کے
جانے کب بادل کے رتھ پر بیٹھ کر
بجلیوں کے تازیانے مارتا
بارشوں کے پانیوں میں بھیگتا
میں اُڑاؤں آندھیوں کے راہوار
پھر بلاتے ہیں مجھے نیلے پہاڑ

ایک خواب

ساتھ اگر تم ہوں تو پھر ہم
ہنستے ہنستے ' چلتے چلتے'
دُور آ کاش کی حد تک جائیں
کالی کالی سی دلدل سے
تپتا تانبا پھوٹ رہا ہو

مکڑی کے جالے کا فیتہ
کاٹ کے ہم اُس باغ میں جائیں
جس میں کوئی کبھی نہ گیا ہو

کو کنار کے پھول کھلے ہوں
بھونرے اُن کو چوم رہے ہوں
پتھر سے پانی چلتا ہو

میں پانی کا چلّو بھر کر
جب ماروں چہرے پہ تمہارے
پہلے تم کو سانس نہ آئے
اور پھر میرے ساتھ لپٹ کر
ایسے چھوٹے دھار ہنسی کی
جیسے چشمہ پھوٹ رہا ہو

پہچان

کہیں تم ملو تو
مسائل کو اُلجھا ہوا چھوڑ کر ہم
علائق کی زنجیر کو توڑ کر ہم
چلیں اور کنجِ چمن میں کہیں
سایہء تاک میں بیٹھ کر
بھولے بسرے زمانوں کی باتیں کریں
اور اِک دُوسرے کے خد و خال میں
اپنے کھوئے ہوئے نقش پہچان کر
محوِ حیرت رہیں
اور نرگس کی صورت
وہیں جڑ پکڑ لیں

درختو!

درختو! تم سے ملنے کی گھڑی جانے کب آئے گی
پلٹ کر پھر وہ فصلِ دوستی جانے کب آئے گی

درختو! میں جہاں کے جال میں اُلجھا ہوا طائر
اُلجھتا جا رہا ہوں اور' جتنا پھڑ پھڑاتا ہوں'
وہ اِک بوڑھا شکاری جس کے ہاتھوں میں درانتی ہے
وہ جس کی مُٹھّیوں میں بند قسمت کے نوشتے ہیں
اُسی کی چاپ سے اُمید بھی ہے وسوسے بھی ہیں
درختو! جانے میرے حق میں اُس کا فیصلہ کیا ہو

درختو! روزنوں سے جال کے، اکثر نظر میری
تمہارے سبز لرزاں ہاتھ کی جنبش پہ پڑتی ہے
خدا جانے یہ شوقِ وصل ہے یا رمزِ رخصت ہے
وداعِ واپسیں ہے یا گلے لگنے کی حسرت ہے
پلٹ کر آ سکوں گا پھر کبھی میں آشیانے میں
کہ مر جاؤں گا بوڑھی مُٹھّیوں کے قید خانے میں
درختو! تم سے ملنے کی گھڑی جانے کب آئے گی

جست

مرا حال یہ تھا
زمستاں میں جب برف زاروں میں چلتے ہوئے
گرسنہ بھیڑیوں کی قطاریں گزرتیں
تو میں کپکپاتا
یہ جی چاہتا' عرصۂ زیست کو چھوڑ کر
کوہساروں کے اُس پار ڈیرہ لگا لوں
اِدھر' میرے جاتے ہی برفیں پگھل جائیں
گُرگانِ بے مہر میرے نقوشِ قدم سونگھ کر مجھ تک آنے نہ پائیں

مگر اب تو جیسے
مری رُوح میں کوئی چیتا سا انگڑائیاں لے رہا ہے
یہ جی چاہتا ہے
کہ گُرگ آشتی کی سبھا جب لگے
میں بھی تصویر جیسی کھلی آنکھ لے کر

——— جو ہرگز جھپکتی نہ ہو ———

غار کے وسط میں آن بیٹھوں

اور اِن میں سے جس جس کی آنکھیں جھپکتی چلی جائیں

وہ لحظہ مرا رزق ہو

میں اُسے پارہ پارہ کروں

طلوع

میں بطنِ ماہی کے گھُپ اندھیرے میں
بے بصر تھا
کبھی گریباں میں جھانکتا تھا
تو اپنے اندر بھی بحرِ ظلمات کے تلاطم کی چاپ سنتا

اچانک اِک روز جب لرزتی ہوئی سپیدی کا تار
حدِّ نظر پہ اُبھرا
تو لب پہ دیوانہ وار چیخیں کچھ ایسے آئیں
کہ جیسے اِک عمر سے بھٹکتے ہوئے سفینے کے
ریش و ناخن دراز ملاح
دُور کے پانیوں میں لٹکی

زمیں کی بھوری زبان دیکھیں
تو گنگ ہونٹوں میں جان پڑ جائے

غرض کہ اب شپّروں سے، بُوموں سے، میرا وقتِ فراق آیا
کہ میرے باطن کے گھپ اندھیرے میں لحظہ لحظہ
عقاب کی آنکھ کھل رہی ہے
اور اُس کے روزن سے
صبح کی سیمگوں فضاؤں میں
میں، تذروں کو محوِ پرواز دیکھتا ہوں

آخری فیصلے کا عذاب

پہاڑ پر میں کھڑا ہوا ہوں
چہار جانب یہ تیرگی جو اُمڈ رہی ہے
مرا تذبذب بڑھا رہی ہے

پہاڑ کے اِک طرف ہیں تا دُور پیچ و خم ہاتھ کی لکیریں
کہ جن پہ زرد اور سیاہ رنگت کی چیونٹیاں کلبلا رہی ہیں
سیاہ اژدر، فلک کی جانب اٹھائے نتھنے
سیاہ انفاس کے دھوئیں سے فضا میں کالک ملا رہے ہیں
دھوئیں کے اِن بادلوں کے نیچے
لرزتے رنگوں کی جھلملاہٹ
کہ جیسے خوش رنگ، کانچ کے جگنوؤں کا چھینٹا

پہاڑ کے دوسری طرف

سبز پوش ڈھلوان —— دیودار اور چیڑ کی محفلیں
جڑی بوٹیوں کے مسکن
پہاڑ کے اِس طرف بھی جگنو
اصیل جگنو
یہ بوٹیاں جو اُمڈتی تاریکیوں کے پردے میں
سانپ کے مَن کی طرح سے جگمگا رہی ہیں
اِنہیں کسی نے چھوا نہیں ہے
اگر مرے پاؤں اِن میں جائیں
تو پہلی پگڈنڈیاں بنائیں

مگر یہاں کی اچھوتی سرسبزیوں میں
کیسی خموش، کتنی عمیق ہیبت ہے
جس سے دل، آپ اپنی دھڑکن سے ڈر کے سینے میں سہم جائے

غروب ہونا ہے مجھ کو
میں اِس پہاڑ کی کس جہت میں ڈوبوں ——؟

سبز سے سفید میں آنے کا غم

نظر اُٹھاؤں
تو سنگِ مرمر کی کور، بے حس
سفید آنکھیں
نظر جھکاؤں تو شیرِ قالین گھورتا ہے
مرے لیے اِس محل میں آسودگی نہیں ہے
کوئی مجھے اِن سفید پتھر کے گنبدوں سے رہا کرائے
میں اِک صدا ہوں
مگر یہاں گنگ ہو گیا ہوں
مرے لیے تو
اُنہیں درختوں کے سبز گنبد میں شانتی تھی
جہاں مری بات گونجتی تھی

چھُٹّی کے دِن دفتر میں پھول

چھ دن کاغذ کا پیراہن پہنے گزرے
بہری، اندھی فریادوں کی بھیڑ میں گھنے گھنے گزرے

آج تو اپنے آپ میں آئیں
پھول بنیں مہکیں مسکائیں
ہرے بھرے پیڑوں میں سن کر مست ہوا کی تھاپ
دُور دُور تک کہیں نہیں ہے کاغذ کے چلنے کی چاپ

سات دنوں میں ایک یہ دن ہے اپنے آپ میں آنے کا
ہنسنے کا مسکانے کا

بھونروں سے نین ملانے کا
کل پھر کاغذ ہو جائیں گے
بہری اور اندھی فریادوں کی اِک بھیڑ میں کھو جائیں گے
آج تو اپنے آپ میں آئیں

دُھند اچھی ہے

دُھند اچھی
ہے
مرے ذہن کی ہم زاد ہے دُھند
دُھند اچھی
ہے
ہر اک جبر سے آزاد ہے دُھند

دُھند میں ڈوبے ہوئے خار و گُل و سنگ و زُجاج اچھے ہیں
ایک ابہام میں تحلیل ہوئے جاتے ہیں منظر سارے
پردۂ ذہن پہ کجلائے ہوئے شہر کی تصویر ہے دُھند
خواب میں دیکھے ہوئے خواب کی تعبیر ہے دُھند

ہاں مگر دُھند کے اُس پار چمکتا سورج
تُند خو، شعلہ نفس، ہو نکتے مرکب پہ سوار
اپنی ہیرے کی کنی ایسی اَنی لے کے بڑھا آتا ہے

شگوفے

میں سوچتا ہوں خدا جانے کتنے دل تھے جنہیں
لہو میں گھُل کے بھی آنکھوں کا راستہ نہ ملا
نہ جانے کتنے جگر غم کے تیر کھا کھا کر
وفورِ درد سے پتھر ہوئے پگھل نہ سکے

نہ جانے کتنے حسیں کارواں شگوفوں کے
ہزار قافلۂ رنگ و بو جلو میں لیے
سمندِ ذوقِ نمو پر سوار شعلہ بجاں
اِسی طلب میں کہ ہستی کا پیرہن مل جائے
ضمیرِ شاخ میں جل بجُھ گئے نکل نہ سکے

اِنہیں شگوفوں کے زُمرے میں وہ خیال بھی ہیں
جو میرے سینے کی ہر موجِ خوں میں غلطاں ہیں
مگر جو میری تنک ظرفیٔ زباں کے سبب
ہنوز پیکرِ حرف وصدا میں ڈھل نہ سکے

چند لمحے

چند لمحے جنہیں اک لغزشِ پا نے میری
کہیں ماضی کے اندھیروں میں کچل ڈالا تھا
چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح لہرا کر
میرے احساس کے ہر گوشے پہ چھا جاتے ہیں
میری آنکھوں سے مئے خواب اُڑا جاتے ہیں
رات بھر کے لیے دیوانہ بنا جاتے ہیں

خون ہو جاتا ہے جب سوزشِ پنہاں سے بھڑکتا ہوا دل
تیرنے لگتا ہے رگ رگ میں لہو ہو کے دھڑکتا ہوا دل
کپکپاتے ہوئے ہونٹ
تھرتھراتی ہوئی نبض
ٹمٹماتے ہوئے آنکھوں کے دیے
گود میں سیلِ فراواں کو لیے
ایسی حالت میں کوئی کیسے جئے، کیسے جئے؟

پا بہ گِل سر بفلک

آج کا دن بھی اُسی اپنی روش پر گزرا
آج کی شب بھی اُسی اپنے قرینے پہ ڈھلی
آج بھی کم نہ ہوئی سوزِ دروں کی تگ وتاز
دیکھ کر چاند ستارے — مرا ذوقِ پرواز
میرے ٹوٹے ہوئے شہپر سے اُلجھتا ہی رہا
پا بہ گِل سر بفلک ہے مری ہستی کا شجر
میں بلندی میں سمانے کو ہُمکتا ہی رہا

ہے اُدھر عرشِ بریں میرے تجسّس کا ہدف
اور اِدھر فرشِ زمیں میرا عناں گیر بھی ہے
نہ اُمنگوں سے رہائی نہ شکستوں سے فرار
یعنی اِس پاؤں میں چکر بھی ہے زنجیر بھی ہے

دُعائے نیم سنگ

میں اُس جہانِ طلسم میں ہوں
جہاں ہزاروں ہی شاہزادوں نے
مڑ کے دیکھا ہے
اور پتھر کے ہو گئے ہیں

کمر کمر میں بھی سنگ بستہ
مقامِ اعراف میں کھڑا ہوں
چلوں تو مُردوں کی بے حسی ہے
تھموں تو زندوں کی بے کلی ہے
مگر مرا دل دھڑک رہا ہے
مگر مری آنکھ میں نمی ہے

مگر مرے ارد گرد پتھر کے شاہزادے ہیں
جن کے سنگیں لبوں پہ عیّار سامری نے
وہ ایک پتھر کی مسکراہٹ تراش دی ہے
جو دائمی ہے
یہ ہنس رہے ہیں
بہشتِ غفلت میں بس رہے ہیں
یہ بے تاثّر جبین اِن کی
مثالِ سنگِ مزار، پتھر کی ہو چکی ہے
دلوں سے آنکھوں تک آنے والی
وہ اِک رگِ اشک بار، پتھر کی ہو چکی ہے

اب اِس سے پہلے کہ میرے ہاتھوں میں بھی رگِ سنگ دوڑ جائے
میں ہاتھ اُٹھاؤں
''خدائے قدّوس! بھیج اُس مردِ منتظر کو
جو ہم پہ آبِ حیات چھڑکے''

دل کو جانے....

دل کو جانے یہ دُھن کیا ہے
دُنیا سے الگ ہو جانے کی
اپنے اندر کھو جانے کی
دل کو جانے یہ دُھن کیا ہے

رستوں پہ کبھی پھرتے چلتے
لوگوں سے کبھی ملتے جلتے
چپکے سے کان میں کہتا ہے
جو کچھ ہے خواب ہے دھوکا ہے
چل دُور کہیں تنہائی میں
میں اور تو مل کر سوچیں گے
تدبیر کوئی ' اِن خوابوں میں
تعبیر کوئی ہو جانے کی
دل کو جانے یہ دُھن کیا ہے

چل اے دل آسماں پر چل

چل اے دل آسماں پر چل
وہاں سے چل کے اس پُر شور بزمِ ہست کو دیکھیں
بلند و پست کو دیکھیں
زمیں کی سرنگونی آسماں سے کیسی لگتی ہے
پہاڑوں کی سرافرازی وہاں سے کیسی لگتی ہے
کفِ دست جہاں کی پیچ وخم ریکھائیں کیسی ہیں
جو تیری راہ کا پتھر ہیں وہ کٹھنائیں کیسی ہیں
چل اے دل آسماں پر چل

دل تو اب یہ چاہتا ہے

دل تو اب یہ چاہتا ہے
رشتہ سب سے توڑ کے
دنیا سے منہ موڑ کے
جا نکلے اُس اور
جہاں چلے نہ کوئی زور

کوئی نفی ہو اور نہ کوئی اثبات
دُور دُور تک دِیے جلائیں
کِھلتے پھول ——— اور راس رچائیں
جھومتے جھونکے، دفیں بجاتے پات
اور مرے ٹھنڈے شانے پر
خوشبو ایسا اِک نادیدہ ہات
پاگل دل تو اب یہ چاہتا ہے

ڈوبتے سورج کا خود کلامیہ

چلو خورشید اُتر جائیں پسِ کہسارِ گم نامی
ڈبو دیں جھیل کے پانی میں اپنی زرد پیشانی
ملیں مٹی بدن پر جھیل کے پاتال سے لے کر
کہ جس کی سوندھ سے بیتے دنوں کا واہمہ پلٹے
درختوں کی جڑوں میں رکھ کے سر سبزے میں کھو جائیں
سُنیں چڑیوں کا پیہم شور کرنا شاخساروں میں
چراگاہوں میں ننھی تِتلیوں کی خوش دِلی دیکھیں
پسِ مژگاں مچلتے آنسوؤں کی بے کلی دیکھیں
جو بے اذنِ روانی آنکھ سے دامن تک آ جائیں
اور اُن کے آئنوں میں حافظہ کھویا ہوا پلٹے
ہوا کی زد پہ لائیں جسم اپنا ' پیرہن اپنا
بسی ہے جس میں بوئے ناگوار اوجِ وجاہت کی
چلو خورشید اتر جائیں پسِ کہسار گم نامی
کہ ہم کو خوش نہیں آتی فضا افلاک شہرت کی

قربِ قیامت

یہ چڑیا جو پنکھے سے ٹکرا گئی ہے
اسے تو فقط آشیانہ بنانے کی دُھن تھی
اسے وقت کی پیٹھ سے لاکھ، دولاکھ، سالوں کے گرنے کا اندازہ کب تھا
اسے کیا خبر تھی
وہ سرسبز ایّام مرجھا چکے ہیں
وہ انساں سے پہلے کے شاداب جنگل
جہاں گھونسلوں اور اُڑانوں کے مابین
دھاتوں کی برّاں فصیلیں نہیں تھیں

عقابوں کے پر آج بھی سرسرائیں
تو معصوم چڑیوں کے دل سہم جائیں
مگر ان کو معلوم کیا ہے
کہ قُربِ قیامت کے آثار پیدا ہیں
بے جان لوہے کو پر لگ گئے ہیں

فیصلہ

اب کے دیوار میں دروازہ رکھوں یا نہ رکھوں
اجنبی پھر نہ کوئی در پئے آزار آ جائے
ایک دستک میں مری ساری فصیلیں ڈھا جائے
اب کے دیوار میں دروازہ رکھوں یا نہ رکھوں

ایک اہرام نہ چن لوں صفت دودِ حریر
کوئی آئے تو بس اک گنبدِ در بستہ ملے
رازِ سر بستہ ملے
لاکھ سر پھوڑے صدا کوئی نہ مجھ تک پہنچے
قاصدِ موجِ ہوا کوئی نہ مجھ تک پہنچے
اب کے دیوار میں دروازہ رکھوں یا نہ رکھوں

سارے اندیشے مگر ایک طرف
ایک طرف تیری اُمید
جانے کس وقت اِدھر تیری سواری آ جائے
اجنبی لاکھ کوئی میری فصیلیں ڈھا جائے
مجھ کو دیوار میں دروازہ لگانا ہوگا

محاسبہ

ہوا کہیں نام کو نہیں تھی
اذانِ مغرب سے دن کی پسپا سپاہ کا دل دھڑک رہا تھا
تمام رنگوں کے امتیازات مٹ چکے تھے
ہر ایک شے کی سیہ قبا تھی

جگہ جگہ بام و در کے پیکر
اُفق کے رنگین چوکھٹے میں
مثالِ تصویر جم گئے تھے
شجر حجر سب کے سب گریباں میں سر جُھکائے
محاسبہ کر رہے تھے دن بھر کے نیک و بد کا
طویل قامت حزیں کھجوریں
کٹی ہوئی ساعتوں کے ماتم میں
بال کھولے ہوئے کھڑی تھیں

نشیمنوں کو پلٹتے طائر
کچھ ایسے تھم تھم کے اُڑ رہے تھے
کہ صفحۂ آسماں پہ گویا
سرابِ پرواز بن گئے تھے

اِدھر مرا دِل
دھڑک دھڑک کر
عجیب عبرت بھری ندامت سے سوچتا تھا
کہ آج کا دن بھی کٹ گیا ہے

ہم زاد

میں آج دفتر میں صبح پہنچا
تو اِک نیا زرد زرد چہرہ نظر پڑا
جس کو دیکھتے ہی
معاً مرے دل میں اِک دریچہ کھلا
اور اُس کے عقب سے
اُس زرد شکل کی ہم شبیہ
اک سُرخ شکل اُبھری ——
شریر، گستاخ، بے تکلّف ——
اُبھر کے میرے قریب آئی

قریب آ کر
نظر ملا کر
وہ کھلکھلا کر ہنسی

اور اپنے شریر پوروں سے
میرے کالر کی سختیاں پائمال کر دیں
سفید بالوں کے پیچ وخم میں
سیاہیوں کی لکیر کھینچی
نگاہ سے سب خشونتیں
اور جبیں سے سب سلوٹیں مٹا دیں
مجھے دریچے سے لے کے نکلی

طویل راہوں پہ
سبزہ زاروں میں
لہلہاتے حسین کھیتوں میں
چاندتاروں میں پھر رہی تھی
کہ جب اچانک
دریچۂ دل کے بند ہونے سے وقت کے پُل صراط کی تیز ڈور ٹوٹی

وہی سفیدی کے پیچ وخم تھے
وہی سفیدی کے پیچ وخم کے تلے جبیں پر شکن

نگہ میں خشونتیں

رُوبرو وہی زرد زرد چہرہ
جو کانپتی انگلیوں سے فائل کو میز پر رکھ کے ہٹ رہا تھا

اورئنٹل کالج کے لیے ایک نظم

اُٹھتی ہے حنائی بام و در سے
کھوئے ہوئے حافظے کی خوشبو
پھر جاگ اُٹھے ہیں دشتِ دل میں
سوئی ہوئی ساعتوں کے آہو

ہر سنگ یہاں کا آئنہ ہے
ماضی کا جو عکس لے رہا ہے
مانوس قدم عقب سے آ کر
آنکھوں پر ہاتھ رکھ رہے ہیں
کہتے ہیں کہ بوجھئے تو جانیں

جو آ کے کلاس رُوم کے پاس
بازو پھیلا کے رُک گیا تھا

بچوں پر اپنے جھک گیا تھا
برگد کا وہ پیڑ کٹ چکا ہے
لاشہ بھی یہاں سے ہٹ چکا ہے

اب بھی ہیں یہاں ہزار چہرے
باندھے ہوئے آرزو کے سہرے
راتیں ہیں یہاں وہی، وہی دن
سب کچھ ہے وہی، ہزار، لیکن
جو ہم سے کبھی یہاں رہی ہیں
وہ سادگیاں کہاں رہی ہیں ؟

وہ وضع، وہ خود سے بے نیازی
کچھ من کی خبر نہ تن کا کچھ ہوش
اِک بے خبری کی رَو زمانہ !
فردا تھا کوئی نہ تھا کوئی دوش

دُکھتا ہوا دل اُداس ایّام
جلتا ہوا دن، بجھی بجھی شام

آنکھوں میں غموں کی تیرتی مُہر
لیکن ہونٹوں پہ ضبط کی مہر

اِک نقشِ قدم کی پیروی میں
دن رات اُداس اُداس چلنا
کہنا نہ کسی سے درد ہرگز
جلنا، جلنا، خموش، جلنا

پہچان کے ایک لمسِ مانوس
ہاتھوں میں کتاب تھام لینا
اور دستِ خیال میں کسی کی
یادوں کے گلاب تھام لینا

سوچا نہ کبھی کہ چُپ رہے سے
یہ زخم تو راز ہی رہے گا
غنچہ جو کِھلے تو بو بھی پھیلے
پائے گا وہی جو کچھ کہے گا

دل اپنی مہک میں آپ گم تھا
ہم سود وزیاں ذرا نہ سمجھے
کہتے بھی تو کیا کسی سے کہتے
جب اپنا ہی مدّعا نہ سمجھے

اب بھی ہے طلسمِ عشق جاری
مجنوں ہے قتیلِ چشمِ آہو
کم کم ہی کہیں ملے گا لیکن
اُن گُنگ محبتوں کا جادو

اکیس اپریل

موت نے پہلے جُھک کر
قدم اُس کے چومے
اور اس سرد بوسے سے یخ بستہ ہوتی ہوئی جوئے خوں میں بھی ——
اور اُس قلبِ بیدار کے سات چکر لیے
اور اُس ذہنِ برّاق کی نور رہی نوردہلیز پر آ کے ٹھٹکی

"اجازت اگر ہو
تو اس جگمگاتی مقدّس امانت کو
اِن تیرہ ہاتھوں سے چھولوں"

کہا: مرحبا!

اے فرستادۂ خالقِ نیست و ہست و غیب و حضور

یہی حکم ہے تو خد و خالِ خورشید پر

پردۂ شب گرا دے

مگر ہوشیار!

آخری سانس کے ساتھ

جب تو مرے جسمِ خاکی سے نکلے

تو میرے لبوں پر لکھی مسکراہٹ کو

پامال کر کے نہ جانا''

عبدالنبی کوکب

ایک ہی پل میں اُڑ گئیں کیسے کیسے علوم کی کرچیں
ریزہ ریزہ جن کا تو نے کاسۂ سر میں دان لیا تھا
مِٹتی ہوئی تحریروں سے اور پارہ پارہ جھڑتی ہوئی کتابوں سے

مجھ کو یاد ہے تو نے بھری جوانی تج کر
اپنی ذات کی ساری رام کہانی تج کر
عیش و آرام دُنیائے فانی تج کر
اِک گوشے میں گُھٹ کر مِٹ کر
عطر کشید کیا تھا سینکڑوں سال کے سوکھے گلابوں سے
ایک ہی پل میں اُڑ گئیں.......................

آج وہ کاسہ، بھرا بھرا سا کاسہ، تیرے سر کا
جس میں صرف ہوئی تھیں کتنے برسوں کی تعمیریں

کتنی مٹی مٹی تحریریں
ایک ہی لغزش سے کیوں چوک میں گر کر ٹوٹ گیا
کیسے چھوٹ گیا؟
تُو تو اسے سنبھال کے چلنے میں برسوں کا ماہر تھا
کیا یہ تیری لغزش تھی؟

میرے سوال پہ چپ چپ ہنستا ہے وہ تیرا
ہنستا ستارے جیسا چہرہ
جو مُرجھانے سے پہلے ہی ڈوب گیا
سو کبھی نہیں مرجھائے گا
میرے سوال پہ چپ چپ ہنستا جائے گا
''کیا یہ تیری لغزش تھی؟''

میرے جواب میں کہنے والا کہہ گیا
اور میں اُس کے کہے پہ سوچتا رہ گیا
''قانون آنکھیں میچے ہوئے ہے
قاتل پہیئے بے پہرا ہیں''[1]

---

[1] مجید امجد کی نظم ''ایکسیڈنٹ'' سے اقتباس۔

سلیم بے تاب

کہیں وہ ملتا تو پوچھتا ہیں
کہ جب تصادم ہوا
تو تیری نظر سے کس کس کے خواب
دل کی تہوں میں کیا کیا خیال گزرے؟

کہیں وہ ملتا تو پوچھتا میں
کہ جب تصادم نہیں ہوا تھا
تو تیری سوچوں کا رنگ کیا تھا؟

تجھے خبر تھی کہ دو قدم پر سفر کا انجام ہو رہا ہے؟
تجھے خبر تھی کہ آسمانوں کی رہگزر راہ میں پڑے گی؟
تری چھٹی حس کو آہٹ سُنائی دی تھی؟

کہ تو فقط اپنے دل کی کھڑکی کے
صاف شیشے پہ آنکھ رکھے
بہارِ تخییل دیکھتا تھا
سخن کی شاخوں سے اَدھ کھلے پھول چن رہا تھا؟

مگر وہ شخص اب کہاں ملے گا
وہ اپنی درویش مسکراہٹ کا نقش
دنیا میں چھوڑ کر
خود اُفق کے اُس پار جا چکا ہے

ملا تو اُس دن ملے گا
جس دن کے ہول سے سر سفید ہوں گے
دلوں کی الواح پر ہر اک نقشِ آشنائی سراب ہوگا
نہ مجھ کو تابِ سوال ہوگی، نہ اُس کو اِذنِ جواب ہوگا

ایک اچانک موت کا نوحہ

بظاہر یہ لگتا ہے
اُس ملگجی صبح کو سب سہاروں نے جیسے
اچانک ترا ساتھ چھوڑا
سحر نے زمیں پر قدم جب رکھا
تو اچانک زمیں بے وفا ہو گئی
اُبھرتا ہوا آفتاب
ایک ہی ناگہاں لغزشِ پا سے یوں لڑکھڑایا
کہ مغرب کے پاتال میں منہ کے بل جا سمایا
اچانک فرشتے کفن سائباں کی طرح تان کر
آسمانوں سے اُترے
گلوں کی مہک کی جگہ، دفعتہً، بوئے کافور کی سرد مہری نے لے لی
شجر کے بدن سے نئی کونپلوں کی بجائے خزاں پھوٹ نکلی
بظاہر یہ لگتا ہے......

لیکن بھلا حادثہ ایک دم کب ہوا ہے
بہت دن سے اس سربمہر آتشیں راز کا گنگ فیتہ
خموشی سے جلتا چلا جا رہا تھا
فنا کے گرجتے ہوئے آبشاروں کے اُوپر تنا
رسیوں کا یہ پُل
ایک مدت گلتا چلا جا رہا تھا

ایک پیدل چلنے والے دوست کا نوحہ

ہجوم سے بچ کے
سُونے سُونے، خموش رستوں پہ چلنے والا
وہ اِس زمانے میں پا پیادہ مسافرت کا امین
رستہ بدل چکا ہے

نظر عبث اُس کا نقش
مانوس راستوں پر
تلاش کر کر کے چونکتی ہے
مجھے خبر ہے وہ جا چکا ہے
یہ جا بجا راہ میں اُبھرتی شبیہ اُس کی
نگاہ کی تشنگی نے مثلِ سراب ایجاد کر رکھی ہے

جب آخری بار اُس کو دیکھا
تو اس کا رستہ بدل چکا تھا
ہر اک طریقہ بدل چکا تھا
ہجوم سے بچ کے چلنے والا
ہجوم کے ساتھ چل رہا تھا

جب آخری بار اُس کو دیکھا
تو عمر بھر کی مسافرت کے خلاف
اُس کو سوار دیکھا
اور اُس کے پہلو میں پا پیادہ ہجوم کو سوگوار دیکھا

نوحہ

تو دیکھنے میں مائلِ شوقِ سفر نہ تھی
ایسا سفر کرے گی، کسی کو خبر نہ تھی

وہ عزم تھا ترا کہ کسی سے نہ ٹل سکا
وہ زخم تھا کہ کوئی دوا کارگر نہ تھی

اے مادرِ شفیق سے مجھ پر شفیق تر
میرے نصیب میں تری گردِ سفر نہ تھی

کیوں آ سکا نہ تیرے قدم چومنے کو میں
اتنی تو تیرے دل کی تڑپ بے اثر نہ تھی

کیسے سمٹ گئی تری شفقت کی داستاں
تیری تو کوئی بات کبھی مختصر نہ تھی

پُرہول وادیوں میں یہ تنہا سفر کا عزم
تو زندگی میں تو کبھی ایسی نڈر نہ تھی

میں آؤں آستاں پہ ترے اور تو نہ ہو
صورت یہ خواب میں بھی تو پیشِ نظر نہ تھی

دل پر گزر رگئی جو قیامت وہ کیا کہوں
مانا کہ دیکھنے میں مری آنکھ تر نہ تھی

نوحہ

تنہائیوں کو دیدۂ پُر آب دے گئی
یعنی صدف کو گوہرِ نایاب دے گئی

دل پر کھُدی ہوئی وہ تری صورتِ شفیق
بے خواب ساعتوں کے لیے خواب دے گئی

خود ہو گئی غروب، مگر میری آنکھ کو
اشکِ رواں کے انجمِ شب تاب دے گئی

خاکِ لحد میں ڈوبی ہوئی شفقتوں کی یاد
دریائے دِل کو گردشِ گرداب دے گئی

ہنستے ہوئے بھی دل میں: واں موجِ غم رہے
کیسے عجیب درد کے آداب دے گئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
رائگاں

خورشید رضوی

ثریّا کے نام

میں ساتھ ترے شورشِ طوفاں کے لئے ہوں
تو ساتھ مرے راحتِ ساحل کے لئے ہے

ترتیب

خورشید رضوی کی شاعری

پاکستان میں دو طرح کے شاعر ہیں۔ ان کی ایک قسم ہر وقت اور ہر دم صفحۂ ظہور پر رہتی ہے۔ ان کی ہستی اسی سبب سے ہے اور وہ اس سے یکسر غافل نہیں رہتے۔ دوسری طرح کے شاعر نمائشِ شعر سے زیادہ تخلیقِ شعر میں مبتلا رہتے ہیں اور خورشید رضوی اسی دوسری قبیل کے شعراء میں سے ہیں۔ کاروبارِ حیات ان کے لئے فقط کاروبار نہیں وہ اس سے ایک نئی حقیقت ایک طرزِ حیاتِ نو کے بارے میں سوچتے اور اس کا اظہار کرتے ہیں اور ایسے شاعر دور موجود میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

خورشید رضوی کے کلام کے بارے میں اپنے تجزیے کی تصدیق کے لئے ان کی صرف ایک غزل پیش کروں گا کہ کلامِ شاعر ہر طرزِ تنقید سے زیادہ معتبر ہوتا ہے:

یہ جو ننگ تھے یہ جو نام تھے مجھے کھا گئے
یہ خیالِ پختہ جو خام تھے مجھے کھا گئے

کبھی اپنی آنکھ سے زندگی پہ نظر نہ کی
وہی زاویے کہ جو عام تھے مجھے کھا گئے

میں عمیق تھا کہ پلا ہوا تھا سکوت میں
یہ جو لوگ محوِ کلام تھے مجھے کھا گئے

وہ جو مجھ میں ایک اکائی تھی وہ نہ جُڑ سکی
یہی ریزہ ریزہ جو کام تھے مجھے کھا گئے

یہ عیاں جو آبِ حیات ہے اِسے کیا کروں
کہ نہاں جو زہر کے جام تھے مجھے کھا گئے

وہ نگیں جو خاتِمِ زندگی سے پھسل گیا
تو وہی جو میرے غلام تھے مجھے کھا گئے

میں وہ شعلہ تھا جسے دام سے تو ضرر نہ تھا
پہ جو وسوسے تہِ دام تھے مجھے کھا گئے

جو کھلی کھلی تھیں عداوتیں مجھے راس تھیں
یہ جو زہر خند سلام تھے مجھے کھا گئے

منیر نیازی

۱۹-اکتوبر ۱۹۹۵ء

لاہور

مناجات

کبریائی کی رِدا عرشِ بریں پر رکھ کر
بے نیازی کی ادا صرفِ کرم کرتے ہوئے
زینہ زینہ کبھی لاہوت کی رفعت سے اتر

وسعتِ عرصۂ کونین سے کتراتے ہوئے
یوں مرے دل کی جراحت میں سمٹ آ جیسے
جیسے — خوشبو کسی غنچے میں سمٹ آتی ہے

ہے مرے ظرف سے باہر تری عظمت کا تضاد
چھوڑ دے میرے لئے اپنے تنوّع کا جلال
ایک ہی رنگ میں کچھ دیر مرے پاس ٹھہر

بے زبانوں کے لئے دل میں بھرے پیار کا رنگ
سنگ میں محوِ نمو سبزۂ کہسار کا رنگ
دل پہ مرہم کی طرح پرسشِ غم خوار کا رنگ

یوں تو تُو کون سے منظر میں نہیں ہے لیکن
میری درماندہ سی، محدود سی، محجوب سی آنکھ
بس اِسی ایک دریچے میں تجھے مانگتی ہے

نعت

نازاں ہے اِس پہ دل کہ بلایا گیا مجھے
آخر درِ حضورؐ پہ لایا گیا مجھے

اِس راہ میں زمیں کی طنابیں کھنچی رہیں
ہر گام گردشوں سے بچایا گیا مجھے

نادیدہ ایک لمسِ محبت تھا دستگیر
تھک کر اگر گرا تو اٹھایا گیا مجھے

سورج بھی اقتدا میں چلا اور کشاں کشاں
لے کر حضور میں مرا سایا گیا مجھے

ہر کہکشاں کی گرد مرے بال و پر میں تھی
ایسی بلندیوں پہ اڑایا گیا مجھے

اشکوں کی چلمنوں سے زمانے گزر گئے
جو کچھ سنا ہوا تھا، دکھایا گیا مجھے

خورشیدؔ، حاضری یہ نصیبوں کی بات ہے
نازاں ہے پھر بھی دل کہ بلایا گیا مجھے

○

یوں تو وہ شکل کھو گئی گردشِ ماہ و سال میں
پھول ہے اک کِھلا ہوا حاشیۂ خیال میں

اب بھی وہ روئے دلنشیں، زرد سہی، حسیں تو ہے
جیسے جبینِ آفتاب، مرحلۂ زوال میں

اب بھی وہ میرے ہم سفر ہیں روشِ خیال پر
اب وہ نشہ ہے ہجر میں، تھا جو کبھی وصال میں

اُن کے خرامِ ناز کو بوئے گل و صبا کہا
ہم نے مثال دی مگر رنگ نہ تھا مثال میں

اہلِ ستم کے دل میں ہے کیا مرے کرب کا حساب
اُن کو خبر نہیں کہ میں مست ہوں اپنے حال میں

کیسا پہاڑ ہو گیا وقت گزارنا مجھے
زخم پہ جم گئی نظر خواہشِ اندمال میں

تو نے مرے خمیر میں کتنے تضاد رکھ دیئے
موت مری حیات میں، نقص مرے کمال میں

Scanned by CamScanner

○

ابروئے ابر سے کرتا ہے اشارہ مجھ کو
جھلک اُس آنکھ کی دکھلا کے ستارہ مجھ کو

ہوں میں وہ شمع سرِطاق جلا کر سرِشام
بھول جاتا ہے مرا انجمن آرا مجھ کو

رائگاں وسعتِ ویراں میں یہ کھِلتے ہوئے پھول
اِن کو دیکھوں تو یہ دیتے ہیں سہارا مجھ کو

میری ہستی ہے فقط موجِ ہوا، نقشِ حباب
کوئی دم اور کہیں آپ گوارا مجھ کو

دام پھیلاتی رہی سود و زیاں کی یہ بساط
ہاں مگر میرے جنوں نے نہیں ہارا مجھ کو

کچھ شب و روز و مہ و سال گزر کر مجھ پر
وقت نے تا بہ ابد خود پہ گزارا مجھ کو

موجِ بے تاب ہوں میں، میرے عناصر ہیں کچھ اور
چاہیئے صحبتِ ساحل سے کنارا مجھ کو

رزق سے میرے مرے دل کو ہے رنجش خورشید
آسمانوں سے زمینوں پہ اتارا مجھ کو

○

اک شاخِ سبز اور صبا اور نفس مرا
کیا رشکِ آشیانہ بنا ہے قفس مرا

شعلہ ہوں اور گرم روی ہے مری سرشت
بہتر یہ ہے کہ ساتھ نہ دیں خار و خس مرا

کُھلتا ہے جا کے کس کی طبیعت پہ دیکھئے
مجھ سے بھی ماورا، سخنِ دُور رس مرا

چاکِ قفس ہے اور گزرتی ہوئی بہار
تھکتی ہے آنکھ میری نہ چلتا ہے بس مرا

پنہاں جو صاعقے ہیں وہ دل سے نکل نہ آئیں
جب ابرِ یادِ یار سے دامن ہو مس مرا

ہاتھوں کی بھی پناہ نہ کی پیشِ تیغِ یار
سر خم کیا کہ شیوہ نہیں پیش و پس مرا

میں نقشِ پا ہوں وسعتِ صحرا میں پائمال
کیا حال پوچھتی ہے صدائے جرس مرا

خورشید یہ ملالِ طبیعت ہے لازوال
کارِ عبث ہے شغلِ نشاط و ہوس مرا

○

یہ طرح طرح کے جو خوف ہیں اِنہیں دور کر
ترِ دل میں کھَولتی دلدلوں سے ظہور کر

وہ جو شب چراغ، دل و دماغ میں دفن ہے
کبھی اس کے نور سے گھر کو بقعۂ نور کر

یہ زمانہ کیا ہے ترے سمند کی گرد ہے
نہیں انکسار سے مانتا تو غرور کر

تری سرحدوں پہ عجیب ایک طلسم ہے
کبھی اپنی ذات کے ہفت خواں کو عبور کر

کبھی آئینے سے نکل کے سیلِ جہاں میں آ
کبھی دوسروں کے وجود کا بھی شعور کر

نہیں راحتوں میں وہ لذتیں جو تھکن میں ہیں
دلِ ہرزہ گرد! کچھ اور ابھی مجھے چُور کر

جو نہاں ہیں تجھ میں تجلّیاں نہ ہوں رائگاں
کبھی کُنجِ دل کو حِرا بنا کبھی طور کر

ایک خیال

مرے دل میں ایک خیال ہے
کہ میں اپنا جسم اتار کر
تری چشمِ خفتہ کو پَیر کر
ترے شہرِ خواب میں جا بسوں

مرے اترے جسم کی پوستیں
کو اٹھا کے اہلِ زمانہ جب
سوئے شہرِ مرگ روانہ ہوں
تو میں تیرے روزنِ چشم سے
اُنہیں دیکھ دیکھ ہنسا کروں
کبھی اُن کے سوگ کے جھوٹ میں
رچی اُن کی آہِ گراں سنوں
کبھی تیری آنکھ کے تِل میں بیٹھ
کے تیرے اشکِ نہاں گنوں

وہ جو تو نے مجھ سے چھپائے تھے
وہ جو جلوتوں میں بجھائے تھے
وہ جو خلوتوں میں جلائے تھے
وہ چراغ ہوں مرے سامنے
ترے طاقِ جاں میں دھرے ہوئے

مرے دل میں ایک خیال ہے
کہ میں اپنی روح اتار کر
اُسے اُن چراغوں کی لو دکھاؤں
جو قید برف کی سل میں ہیں
اُسے اُن شراروں کی زد پہ لاؤں
جو دستِ سنگ میں بند ہیں
——— ترے دل میں ہیں

یہ نقابِ جسم ہٹے تو ہو
یہ حجاب روح اٹھے تو ہو
تری اصلِ ذات کے سامنے
مری اصلِ ذات کا آئنہ

○

یہ جو ننگ تھے یہ جو نام تھے مجھے کھا گئے
یہ خیالِ پختہ جو خام تھے مجھے کھا گئے

کبھی اپنی آنکھ سے زندگی پہ نظر نہ کی
وہی زاویے کہ جو عام تھے مجھے کھا گئے

میں عمیق تھا کہ پلا ہوا تھا سکوت میں
یہ جو لوگ محوِ کلام تھے مجھے کھا گئے

وہ جو مجھ میں ایک اکائی تھی وہ نہ جُڑ سکی
یہی ریزہ ریزہ جو کام تھے مجھے کھا گئے

یہ عیاں جو آبِ حیات ہے اِسے کیا کروں
کہ نہاں جو زہر کے جام تھے مجھے کھا گئے

وہ نگیں جو خاتمِ زندگی سے پھسل گیا
تو وہی جو میرے غلام تھے مجھے کھا گئے

میں وہ شعلہ تھا جسے دام سے تو ضرر نہ تھا
پہ جو وسوسے تہہِ دام تھے مجھے کھا گئے

جو کھلی کھلی تھیں عداوتیں مجھے راس تھیں
یہ جو زہر خند سلام تھے مجھے کھا گئے

○

نمِ ابرِ بہار میں چلنا
سایۂ یادِ یار میں چلنا

ہو کے بے نقشِ پا، مثالِ صبا
خلوتِ شاخسار میں چلنا

چڑھتے سورج کے روبرو مجھ کو
چاندنی کے خمار میں چلنا

آسماں پر یہ مہروماہ جنہیں
دامِ لیل و نہار میں چلنا

گردشوں سے ملول ہو کر بھی
جبرِ بے اختیار میں چلنا

جسم و جاں نے اِنہی سے سیکھا ہے
اپنے اپنے مدار میں چلنا

دل میں اک موج ہے کہ چاہتی ہے
پھر کسی آبشار میں چلنا

اے لہو تھم بھی جا رگِ جاں میں
کیا دلِ داغ دار میں چلنا

○

وہ جو لوگ اہلِ کمال تھے وہ کہاں گئے
وہ جو آپ اپنی مثال تھے وہ کہاں گئے

مرے دل میں رہ گئی صرف حیرتِ آئنہ
وہ جو نقش تھے، خدوخال تھے وہ کہاں گئے

گری آسماں سے تو خاک خاک میں آ ملی
کبھی خاک میں پرؔوبال تھے وہ کہاں گئے

سرِ جاں یہ کیوں فقط ایک شام ٹھہر گئی
شب و روز تھے، مہ و سال تھے وہ کہاں گئے

مرے ذہن کا یہ شجر اداس اداس ہے
وہ جو طائرانِ خیال تھے وہ کہاں گئے

○

دنیا میں جو اہلِ دل رہے ہیں
آزردہ وہ مستقل رہے ہیں

کچھ دل میں بھی صبر کی کمی تھی
کچھ زخم بھی جاں گُسِل رہے ہیں

ہنگامِ فراقِ جسم و جاں ہے
بچھڑے ہوئے لوگ مل رہے ہیں

جو دامنِ ہوش میں پڑے تھے
خوابوں میں وہ چاک سِل رہے ہیں

پھر دورِ شباب یاد آیا
ڈھلوان پہ پھول کھل رہے ہیں

وہ قُلّۂ کوہسار کے پیڑ
آزاد، ہوا میں ہل رہے ہیں

اک ہم ہیں کہ موسمِ جنوں میں
یخ بستہ و پابہ گِل رہے ہیں

یہ روز و شب اور یہ مہ و سال
خوابوں میں مرے مُخل رہے ہیں

کیوں آج بجھے بجھے ہو خورشیدؔ
یہ رنج تو متّصل رہے ہیں

○

دل پر جو برگِ گُل بھی لگا وار جا لگا
تیرا سخن بھی کل صفتِ خار جا لگا

کہنے کو ہم ہر ایک ستم سے گزر گئے
گزرے کہاں ہیں' روح میں انبار جا لگا

اب عزم کیا ہے اے مرے وامانده ہم سفر
سایہ تو اب فصیل کے اُس پار جا لگا

رک رک گیا زبان پہ آ کر جوابِ تلخ
یونہی کشاں کشاں مجھے آزار جا لگا

پھیلی کہاں کہاں شجرِ زندگی کی شاخ
آخر کو پھل جو تھا وہ سرِ دار جا لگا

شاید تجھے خبر ہو کچھ اے گردشِ سپہر
کس آسماں پہ طالعِ بیدار جا لگا

دن کو بچھی زمیں پہ چنبیلی کی چاندنی
شب کو فلک پہ خیمۂ زر تار جا لگا

وہ میری شاخِ دل میں کِھلا تھا جو ایک پھول
ڈھلتے دنوں میں وہ بھی مجھے بار جا لگا

افسوس تو یہ ہے کہ جو موتی سا تھا سخن
وہ بھی دلوں پہ صورتِ زنگار جا لگا

خورشید جس کی گرمیٔ محفل تھی بات بات
اب وہ بھی نقش ہو، سرِ دیوار جا لگا

تجسیم

سبز پیڑوں کے لہکنے کی طراوت لاؤ
سرخ پھولوں کے مہکنے کی حلاوت لاؤ
دشت کے، وادی و کہسار کے پھول
خون میں کھلتے ہوئے ساعتِ دیدار کے پھول

صاعقہ کوئی فلک سے لاؤ
جس کی مہمیز سے ہر سمت بپھر کر چھا جائے
کف اڑاتے ہوئے نمکین سمندر کی ایال

گھول کر سارے عناصر کا جلال اور جمال
پیکرِ حرف میں لانا ہے مجھے
درد کا جسم بنانا ہے مجھے

○

انبارِ گہر میں کانِ زر میں
کچھ بھی نہ جچا مری نظر میں

افسوس مرا چراغِ منزل
مستور ہے گردِ رہ گزر میں

وہ کون ہے جس کی روشنی سے
بینائی ہے خاکِ بے بصر میں

تاروں کو شمار کر رہا ہوں
کیا کیا ہوا عمرِ مختصر میں

اُس جلوۂ بام کے علاوہ
آیا نہیں فرق بام و در میں

ہر سو سیلاب آ گیا ہے
یا غرق نظر ہے چشمِ تر میں

میں خود سے ابھی نہیں ہوں مایوس
امکانِ بہار ہے شجر میں

کیا عطر کھنچا ہے آب و گِل کا
ہر شاخ میں، پھول میں، ثمر میں

اِتنی بھی نہیں ہے خوب وحشت
آ جائے نہ چل کے دشت گھر میں

ثابت قدمی سے گامزن رہ
کیا رکھّا ہے جادۂ دگر میں

پھر سے وہ ہوا چلی کہ دوڑا
ذوقِ پر و بال، بال و پر میں

تھم جا پل بھر سمندِ ایام
اک لمحہ ملا ہے عمر بھر میں

وہ راہ میں اک شجر تھا سرسبز
اور ہم تھے روانیٔ سفر میں

چاہو تو اِسی کو عیش سمجھو
گزرے گی اِسی گزر بسر میں

تجھ سا موتی نہ مجھ سا کنکر
ڈھونڈے سے ملے گا بحر و بر میں

اُس آنکھ کی نغمگی کے آگے
سُرمہ ہے گلوئے نغمہ گر میں

وہ بھول گئے پلک جھپکنا
جو ڈوب گئے تری نظر میں

کیا شے ہے شراب اِس کے آگے
اک خواب چڑھا ہوا ہے سر میں

کل میں نے بہت اداس دیکھا
خورشید کو مطلعِ سحر میں

○

اک معمّا ہے مری ذات عجیب
بند ہیں مجھ میں تضادات عجیب

کون سی سمت سے توڑوں خود کو
ہے کہیں مجھ میں کوئی بات عجیب

تیرنے والے کبھی ڈوب کے دیکھ
زیرِ دریا ہیں طلسمات عجیب

سرِ مژگاں کوئی چھینٹا نہ پڑا
پسِ مژگاں ہوئی برسات عجیب

ہم تو سمجھے تھے کہ جیتے بازی
نکل آئی ہے مگر مات عجیب

جانے کیا منظرِ کُہسار میں ہے
دل میں آتے ہیں خیالات عجیب

ٹوٹتا کب ہے طلسمِ شب و روز
دن سے نکلے تو ہوئی رات عجیب

یہ خد و خال نہیں تھے اپنے
پیش آئے ہمیں حالات عجیب

ہارنے بھی نہیں دیتی خورشید
روشنی ہے پسِ ظلمات عجیب

○

گرتے ہوئے بدن کا نگر چھوڑ جاؤں گا
گھبرا کے دستکوں سے یہ گھر چھوڑ جاؤں گا

میں عینِ زندگی ہوں ٹھہرنا نہیں مجھے
سب منظروں کو مثلِ نظر چھوڑ جاؤں گا

خود خاک ہو کے گردِ سفر میں رہوں گا اور
اِن بستیوں میں ذوقِ سفر چھوڑ جاؤں گا

ہو گا نہ سوگوار مرے واسطے کوئی
جلتا ہوا دیا ہوں سحر چھوڑ جاؤں گا

ہستی مری عدم ہی سہی صورتِ سحاب
میں سیپیوں میں آبِ گہر چھوڑ جاؤں گا

○

آنکھ کے تِل میں رکا ہے کہ تہہِ دل میں ہے تو
اے مرے اشکِ تپاں کون سی منزل میں ہے تو

آزماتے ہیں سفینوں کو ٹھکانے تیرے
کبھی گرداب میں پنہاں کبھی ساحل میں ہے تو

نارسائی میں رسائی کی تڑپ رکھتا ہوں
کہ سمندر میں ہوں میں اور مہِ کامل میں ہے تو

اے جنوں ہو کے رہا بھی تری وحشت نہ گئی
میر، سمجھتا تھا فقط شورِ سلاسل میں ہے تو

پیشِ آئینہ تری موجِ نگہ دیکھتا ہوں
کبھی خود میں ہے کبھی اپنے مماثل میں ہے تو

اس رہِ شوق کا انجام کہیں ہے ہی نہیں
اے دلِ زار ابھی جس کے اوائل میں ہے تو

خاک پر ایک گہری نظر

خاک آئینہ بھی ہے خاک خد و خال بھی ہے
خاک خود چاک بھی ہے کوزۂ سیّال بھی ہے
چہرۂ خاک پہن لیتا ہے چہرے کتنے

پتھروں میں یہ تپش کھائی ہوئی خاک کے رنگ
اور اِسی خاک سے اِن سبز درختوں کی نمود
اور رگِ تاک کے اندر سفرِ قطرۂ مے
اور اِسی خاک سے یہ دیدۂ بیدار مرا

کتنے گل، کتنے گلوں سے بھی حسیں تر منظر
خاک سے پھوٹتے ہیں خاک میں ڈھل جاتے ہیں
خاک ہے خاک فقط نام بدل جاتے ہیں

○

تاچند بحرِ غم میں دلِ زار جائے گا
آخر جہاں تھمے گا وہیں ہار جائے گا

بہتا ہوا سفینۂ عمرِ دوروزہ میں
خوابیدہ جائے گا کوئی بیدار جائے گا

برسے گی آسماں سے کسی دن دوائے مرگ
روئے زمیں سے زیست کا آزار جائے گا

معصوم طائروں کے لئے دل گرفتہ ہوں
اِن کو بھی آدمی کا عمل مار جائے گا

آخر کو ہنس پڑیں گے کسی ایک بات پر
رونا تمام عمر کا بےکار جائے گا

وہ تیرے روبرو مرا آئینے کا سکوت
تاعمر ذہن سے نہ وہ اسرار جائے گا

اِس بزم سے سبک نہ اٹھے گا کبھی کوئی
ہر شخص آرزو سے گرانبار جائے گا

○

ہرزہ مت جان مری بادیہ پیمائی کو
ڈھونڈتا پھرتا ہوں اک لالۂ صحرائی کو

اُس کے چہرے کی طرف آنکھ اٹھا کر مت دیکھ
شعلہ ایسا ہے کہ لے جائے گا بینائی کو

اُن کی قسمت میں ہے سر پھوڑتے پھرنا کہ جنہیں
سنگِ در مل نہ سکا ناصیہ فرسائی کو

ایک آواز سے ڈرتے ہیں ہم اِتنا کہ مدام
شورِ محشر میں دبا رکھتے ہیں تنہائی کو

اپنا گھر اپنا ہی گھر ہے جب اِسے کھولو گے
درد و غم آن کھڑے ہوں گے پذیرائی کو

دن گزرتے رہے سانسوں میں تھکن آتی رہی
دل میں اڑ اڑ کے وہی گردِ محن آتی رہی

تھک گئے عرصۂ احساس میں چلتے چلتے
راہ میں حسرتِ کوتاہیٔ فن آتی رہی

بس دریچے سے لگے بیٹھے رہے اہلِ سفر
سبزہ چلتا رہا اور یادِ وطن آتی رہی

گلشنِ دہر میں کچھ بوئے وفا باقی ہے
کہ خزاں میں بھی صبا سوئے چمن آتی رہی

پھول آنکھوں سے گزر کر تہہِ دل میں بھی کھِلا
رُت بھی بدلی تو وہی بوئے سمن آتی رہی

اہلِ دنیا زر و گوہر کی تمنا میں رہے
اوس پڑتی رہی سورج کی کرن آتی رہی

ہم کبھی چاک گریباں تھے کبھی خاک بسر
کر گزرتے رہے جو عشق میں بن آتی رہی

○

ہے وقت کبھی پتھر، یارو کبھی دریا ہے
کاٹے نہیں کٹتا ہے، روکے نہیں رکتا ہے

پلکوں پہ نمی سی ہے، لفظوں میں کمی سی ہے
پیہم جسے سہتا ہوں، کم کم اُسے کہنا ہے

اب چشمِ کرم کیسی، اب دل کو بھٹکنے دو
کیوں شام کو گھر آئے جو صبح کا بھولا ہے

ہاں آنکھ پہ ارزاں ہو، اے گریۂ تنہائی
اب میں ہوں سرِ صحرا یا صبح کا تارا ہے

یہ کرب یہ بیتابی گلشن کی فضاؤں میں
اے نکہتِ گل کیوں ہے، اے موجِ صبا کیا ہے

پھولوں کے مہکنے سے، سبزے کے لہکنے سے
کیا ربط ہے باطن کو، کیوں خون مچلتا ہے

بجھتی ہوئی آنکھوں میں جلتی ہوئی خوش فہمی
باطل ہی سہی پھر بھی کہہ دیجیے کہ ایسا ہے

جو نقش ہوا دل پر، اُس جنبشِ ابرو سے
وہ چاند مرے دل میں گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے

تجھ میں بھی بہت کچھ ہے اے عالمِ یکسانی
موتی کبھی شبنم ہے، سیپی کبھی غنچہ ہے

ہے خواب اگر اچھا اتنا بھی غنیمت جان
تعبیر یہاں کیسی، یہ خواب کی دنیا ہے

پھر شاخِ سماعت میں نم دوڑ گیا خورشید
یہ اُس کی ہنسی ہے یا بہتا ہوا چشمہ ہے

ایک خواہش

ایسا کوئی آستاں
جس پہ کوئی مل سکے
ایسا کوئی گلستاں
دل کی کلی کِھل سکے
غار کے منہ پر پڑا
سنگِ گراں ہل سکے

ایسا کوئی آئنہ
جس میں طلسمات ہو
عکس ہی میرا نہ ہو
بلکہ مری ذات ہو
خود پہ نظر ہی نہیں
خود سے ملاقات ہو

ایسی سحر جس میں کاش
پھر وہ فضا آ سکے
گریۂ نمناک کی
آب و ہوا آ سکے
دل کا دریچہ کھلے
دل کی صدا آ سکے

○

سفرِ شام نے رہ رہ کے ڈرایا مجھ کو
جی اُٹھے سنگ و شجر دیکھ کے تنہا مجھ کو

بڑھ کے احباب سے آنکھیں تو کھلی رکھتا ہوں
جانے کیوں خواب نظر آتی ہے دنیا مجھ کو

چودھویں شب کے طلسمات بھی ہوتے ہیں عجیب
سایۂ شاخ لگا' شاخ سے اچھا مجھ کو

میں اندھیروں میں کبھی دل کے سہارے نہ گرا
روشنی پا کے دیا آنکھ نے دھوکا مجھ کو

بہہ گئی عمرِ رواں آبِ رواں کی صورت
اور مرے عکس سے تکتا رہا دریا مجھ کو

خاک کے پار کا منظر بھی جھلکتا ہے مگر
بار دیتا ہی نہیں خاک کا پردا مجھ کو

زور کرتی ہے جو نسبت ہو کسی سے خورشید
شہر میں جا کے بلا لائے گا صحرا مجھ کو

○

عہدِ شباب تیرے ساتھ کتنے حجاب اٹھ گئے
سر سے جنوں نکل گیا آنکھ سے خواب اٹھ گئے

اور بھی ہونٹ جل اٹھے ریت کو ریت مان کر
اور بھی تشنگی بڑھی جب سے سراب اٹھ گئے

جن سے نگہ میں نور تھا دیکھتے دیکھتے وہ لوگ
کرب و بلائے زیست سے صورتِ آب اٹھ گئے

لوحِ خیال پر تری شکل بنی نہ رات بھر
یعنی کتاب عُمر سے کام کے باب اٹھ گئے

اب یہی خام کار ہیں جامِ شراب اِنہی کو دے
وہ تری بزمِ ناز کے رندِ خراب اٹھ گئے

رشتۂ آب توڑ کر، نقشِ سراب چھوڑ کر
اُمّتِ غافلاں سے ہم مثلِ کتاب اٹھ گئے

ہم کو اُس انجمن سے ہے ایک گرُیزِ ناتمام
ہو کے حباب رہ گئے، بن کے سحاب اٹھ گئے

○

یہ مری روح میں گونجتا کون ہے
بند گنبد میں مثلِ صدا کون ہے

کون سبزے کی صورت میں پامال ہے
سرو بن کر چمن میں کھڑا کون ہے

کس سے چھپ چھپ کے ملنے کو جاتی ہے تو
جنگلوں میں، بتا اے صبا، کون ہے

پھول کِھلنے کی کوشش سے اکتا گئے
آنکھ بھر کر اِنہیں دیکھتا کون ہے

بے دلی سے کہاں ہاتھ آتے ہیں ہم
دل لگا کر ہمیں ڈھونڈتا کون ہے

○

قفس سے بال و پرِ طائراں کو دیکھ لیا
پھر اپنے ولولۂ رائگاں کو دیکھ لیا

وہ میرے پاس سے گزرے تو آج پھر میں نے
نگاہِ دشت سے ابرِ رواں کو دیکھ لیا

تھا جو عشق کا سیلِ رواں تو دونوں نے
وجودِ سنگِ رہِ درمیاں کو دیکھ لیا

لبوں پہ مُہرِ خموشی سہی مگر دل نے
کسی کی آنکھ میں اشکِ نہاں کو دیکھ لیا

نظر نظر ہو پر اتنی بھی بے پناہ نہ ہو
بہار آئی تو ہم نے خزاں کو دیکھ لیا

یہاں پلٹ کے نہ اپنی بھی باز گشت آئی
خلوص و مہر کے کوہِ گراں کو دیکھ لیا

مری اصلِ ذات کا مرکزہ

تہِ دل میں زیرِ زمیں کہیں
مری اصلِ ذات کا مرکزہ
کبھی خود بھی مجھ پہ کھُلا نہیں
کہ وہ سرِّ جاں، وہ گرہ ہے کیا

کہ جو کہنہ تر ہے ستاروں سے
کہ جو تازہ تر ہے بہاروں سے
وہ جو فلسفوں سے دقیق تر
ہے، سمندروں سے عمیق تر

کئی آئنوں سے بنا ہوا
وہ ہزار رنگ کا آئنہ
جسے اِک شرر بھی ہے پھلجھڑی
جو ازل سے تابہ ابد جلے
لئے اپنی تابِ شرر فشاں
کے جلو میں کتنے ہی قافلے

جو سرائے وسعتِ ہست سے
—— کئی سالِ نُور کی بات ہے
کہ مثالِ نُور گزر گئے——
کبھی باز دیدہ ہوئے نہیں

جو فرازِ گنبدِ نیست کے
کسی چاہِ روزنِ تیرہ میں
ہیں اسیر مثلِ صدا پڑے
ابھی آفریدہ ہوئے نہیں

یہ ہزار قرن کے قافلے
یہ ہزار رنگ کے سلسلے
یہ حقیر صورتِ گرد ہیں
مری اصلِ جاں کے طواف میں

مری اصلِ ذات کا مرکزہ
وہ جو گرم و سرد چشیدہ ہے
جو ہر ایک پست و بلندِ دہر
میں بار بار دویدہ ہے
کبھی شہدِ لب کی حلاوتیں

کبھی زہر خند کی تلخیاں
یہ تمام سرکہ و انگبیں
اُسے گھولتے تو رہے مگر
وہ گہُر کسی میں گھُلا نہیں

وہ گہُر تلاطمِ بحر میں
وہ مجھی میں مجھ سے بہت بڑا
مری اصلِ ذات کا مرکزہ
کبھی مجھ پہ خود بھی کھُلا نہیں

○

عکس نے میرے رلایا ہے مجھے
کوئی اپنا نظر آیا ہے مجھے

پیشِ آئینہ بہت سوچتا ہوں
کس لئے اُس نے بنایا ہے مجھے

کس لئے وسعتِ صحرا دے کر
تنگ گلیوں میں پھرایا ہے مجھے

کس لئے میرے ہی صحنِ جاں میں
مثلِ دیوار اٹھایا ہے مجھے

میں کہیں اور کا رہنے والا
غم کہاں کھینچ کے لایا ہے مجھے

جس میں اُس چھاؤں کی یاد آ جائے
اب تو وہ دھوپ بھی سایا ہے مجھے

نگہِ ناز سے کیونکر پوچھوں
کیوں نگاہوں سے گرایا ہے مجھے

ہاتھ میں لے کے گریباں میرا
دل نے دل بھر کے ستایا ہے مجھے

سخت حیراں ہوں سرِ کوہ ندا
کون تھا، کس نے بلایا ہے مجھے

○

کچھ پھول تھے، کچھ ابر تھا، کچھ بادِ صبا تھی
کچھ وقت تھا، کچھ وقت سے باہر کی فضا تھی

کچھ رنگ تھے، کچھ دھوپ تھی، کچھ دہشتِ انجام
کچھ سانس تھے، کچھ سانس میں خوشبوئے فنا تھی

کچھ رنگِ شفق تیز تھا، کچھ آنکھ میں خوں تھا
کچھ ذہن پہ چھائی ترے ہاتھوں کی حنا تھی

کچھ گزری ہوئی عمر کی یادوں کا فسوں تھا
کچھ آتے ہوئے وقت کے قدموں کی صدا تھی

صدیوں سے دھڑکتی ہوئی اک چاپ تھی دل میں
ایک ایک گھڑی صورتِ نقشِ کفِ پا تھی

دونوں کو وہی ایک بکھر جانے کا ڈر تھا
میں تھا، گُلِ صد چاک تھا اور تیز ہوا تھی

خورشید سرِ شام تہِ دامنِ کہسار
دل تھا کہ وہی کوہ کی دیرینہ ندا تھی

Scanned by CamScanner

○

دشت و کہسار میں پھرتا ہوں عَلَم غم کے لئے
کوئی تسکین مری خاطرِ برہم کے لئے

آنکھ اٹھاؤں تو ہر اک چیز ہو پانی پانی
ایک جنبش ہے بہت دیدۂ پرنم کے لئے

اے مژہ ضبط سے لے کام بچا کر رکھ لے
یہ جدائی کا ثمر، وصل کے موسم کے لئے

دل دُکھا ہے تو کوئی دوست مقابل نہ رہا
کون آئینہ بنے درد کے عالم کے لئے

رات ڈھل جانے کو ہے دل کا دریچہ کھولو
اب مناسب ہے ہوا گریۂ پیہم کے لئے

سوگوار اب کے کچھ ایسی ہے گلستاں کی فضا
صف بہ صف پھول بھی کھلتے ہیں تو ماتم کے لئے

جادۂ زیست پہ خوشیاں بھی کھڑی تھیں لیکن
یہ مرا دل کہ اٹھا اور قدم غم کے لئے

○

تیری نگاہِ لطف بھی ناکام ہی نہ ہو
دل تو وہ زخم ہے جسے آرام ہی نہ ہو

چونکا ہوں نیم شب بھی یہی سوچ کر
وہ آفتاب اب بھی لبِ بام ہی نہ ہو

تم جس کو جانتے ہو فقط اپنی طبعِ خاص
وہ رنج، وہ فسردہ دلی، عام ہی نہ ہو

آہستہ اِس لرزتے ہوئے پُل پہ رکھ قدم
صدیوں کا انہدام ترے نام ہی نہ ہو

اے دل مفر تو کارِ جہاں سے نہیں مگر
اِتنا تو کر کہ اس میں سبک گام ہی نہ ہو

دستک سی دے رہی ہے دریچے پہ بادِ صبح
اے محوِ خواب سن کوئی پیغام ہی نہ ہو

خورشید تو نے کیسے نبھائیں یہ عُزلتیں
جیسے تجھے کسی سے کوئی کام ہی نہ ہو

نابینائی میں ایک خواب

میں ہوں سرچشمۂ اوّل سے بہت دور

پئے نورُ بھٹکنے والا

روشنی عکس بہ عکس آتی ہے اِن آنکھوں تک

آئنے اپنی خیانت سے نہیں خود واقف

اِن کو معلوم نہیں

زاویے اِن کے بدل دیتے ہیں کرنوں کا مزاج

آج اِس نورِ مُحرّف سے ہے آنکھوں میں تھکن

دل میں خنّاس کی سرگوشیِٔ پیہم کی چبھن

کاش سرچشمۂ اوّل سے اُتر آئے کوئی راست کرن

جو مری روح کی ظلمت میں اجالا کر دے

میں کہ ہوں کور، مجھے دیکھنے والا کر دے

○

یہ سوچتا ہوں مرے ماہ و سال کا کیا ہو
ہجومِ نقص میں خوئے کمال کا کیا ہو

ہر ایک صبح اداس اور ہر ایک شام اداس
یہ جس کا حال ہو، اس خستہ حال کا کیا ہو

حقیقتوں کو تو ہموار کر لیا میں نے
خیال دشمنِ جاں ہے خیال کا کیا ہو

مناسبت ہی مرے دل کو زخم سے ٹھہری
مگر عبث ہوسِ اندمال کا کیا ہو

۷۷

کھُلا نہ کچھ نَفَسِ واپسیں کی حیرت میں
شکست و فتح و عروج و زوال کا کیا ہو

جہاں جواب نہیں صرف باز گشت آئے
وہاں جنونِ صدا و سوال کا کیا ہو

لکھوں میں خود کو سراپا فسردگی خورشید
مگر شگفتگیٔ خال خال کا کیا ہو

○

دیکھتے رہیے یہاں کیا نہ رہے کیا رہ جائے
پائے رہرو نہ رہے نقشِ کفِ پا رہ جائے

دل خود اک داغ ہے سینے میں تو پروا کیسی
داغ رہتا ہے اگر دل میں تو اچھا رہ جائے

یہ بھی ممکن ہے کہ تھم جائے سفینہ دل کا
اور دریا نگہِ یار کا بہتا رہ جائے

عالمِ خواب کا عقدہ نہیں کھلتا یعنی
آنکھ باقی نہ رہے اور تماشا رہ جائے

پاک رہنا ہے جو دنیا سے تو پھر دنیا سے
دامن اِتنا نہ بچا حسرتِ دنیا رہ جائے

کوئی آوازِ جرس بھی ہو بھٹکنے کے لئے
ورنہ ممکن ہی نہیں وسعتِ صحرا رہ جائے

یہیں تھم جائے تو کیا خوب ہو منظر خورشید
لہریں سبزہ و گُل، موج میں دریا رہ جائے

○

سلگتے جنگلوں میں صورتِ موجِ ہوا ہوں
خود اپنی جنبشِ دامن سے جلتا جا رہا ہوں

فرشتے پر سمیٹے ساحلِ خوں پر کھڑے ہیں
فقط میں غرقِ خوں دریائے خوں میں تیرتا ہوں

محبت، شاعری، مستی، فقیری، بے نیازی
یہ سب مجھ میں کبھی تھے اب میں اِن کا نقشِ پا ہوں

جدھر جاؤں فضاؤں میں غبارِ سیم و زر ہے
مرا دم گھٹ رہا ہے سانس روکے چل رہا ہوں

سُرنگیں وقت کی تاریک ہوتی جا رہی ہیں
ردائے سنگ میں جویائے پیوندِ ضیا ہوں

دھواں کچے گھروں سے پرفشاں ہے کیا سماں ہے
سوادِ شام میں گم سم کھڑا ہوں سوچتا ہوں

کسی کے سایۂ دیوار کا طالب ہوں خورشید
مسلسل چلتے چلتے، جلتے جلتے تھک گیا ہوں

○

بقا کو لرزشِ رنگِ فنا سے پہچانا
خدا کو کشمکش ناخدا سے پہچانا

مری نظر نے مجھے میرے آئنے سے نہیں
فقط مرے خدوخالِ انا سے پہچانا

میں آسمان سے اُترا تھا بے لباس مگر
زمیں نے مجھ کو لباسِ وفا سے پہچانا

زمین پر ترے کوچے کو جذبۂ دل نے
دیارِ خُلد کی آب و ہوا سے پہچانا

زمانے بھر سے الگ اپنی ذات کو میں نے
زمانے کی روشِ ناسزا سے پہچانا

ہزار آنکھ سے اوجھل سہی مگر اُس نے
پسِ حجاب مجھے مدّعا سے پہچانا

سفر میں ہم ترے اپنے کہے پہ بھی نہ گئے
تری جہت کو ترے نقشِ پا سے پہچانا

سات سمندر پار وطن کی یاد

اے میرے وطن
اے پیارے وطن
جب اسکولوں کے گیٹ کھُلیں
جب بچوں کا ریلا آئے
پتھر کی سڑک پر پھول کھِلیں
خوشبوؤں کا دریا آئے
جب ایک سی وردی پہنے ہوئے
بچوں کو گھر والے بھولیں
جب سائیکلوں اور تانگوں پر
بستے لٹکیں، تھرمس جھُولیں
تب سات سمندر طے کر کے
اُن کی چاپیں مجھ کو چھولیں
اور دل میں درد کی ہوک اٹھے

اے میرے وطن

اے پیارے وطن

جب رنگ بھرا ہو شاموں میں

جب بُور لدا ہو آموں میں

پھرتی ہو مہک مشاموں میں

جب آگ گلُوں کی دہکتی ہو

جب ڈال سِرس کی لہکتی ہو

نافے کی طرح مہکتی ہو

تب دل کے کنج پہ سایہ کناں

چھتری لہرائے بکائن کی

اور اُس میں چھپ کر بیٹھی ہوئی

یادوں کی کوئل کُوک اٹھے

○

یادوں کو بام و در میں نظر آئے آئینے
لو آج پتھروں میں ابھر آئے آئینے

دنیا ہجومِ عکس تھی ملتا کسی سے کون
بس جیسے آئنوں سے گزر آئے آئینے

دل زعمِ فتح میں ہے گرا کر فصیلِ سنگ
اور اب کے راستے میں اگر آئے آئینے؟

بھاگے حقیقتوں سے تو خوابوں میں گھر گئے
موندی جو آنکھ، آنکھ میں بھر آئے آئینے

کس وہم کی تلاش میں سر پھوڑتا پھرا
نکلا نہ کچھ بھی اور مرے سر آئے آئینے

○

اچانک رخ بدلتی جا رہی ہے
زمیں محور سے ٹلتی جا رہی ہے

ستارے سرخ ہوتے جا رہے ہیں
ہر اک تقدیر جلتی جا رہی ہے

نہ جانے یہ حیاتِ ہرزہ پیما
کہاں گرتی سنبھلتی جا رہی ہے

پرندے آشیانوں کو رواں ہیں
مسلسل شام ڈھلتی جا رہی ہے

مرے بعد اب مری خاکِ لحد میں
مری زنجیر گلتی جا رہی ہے

○

سفر خواب کا عمر بھر کس لئے
ستاروں سے ربطِ نظر کس لئے

نہیں آسماں میں اگر کوئی در
تو پھر خاکداں سے مفر کس لئے

یہ آئینہ ساں آمنے سامنے
بنائے گئے بحروبر کس لئے

زمیں آپ غرقاب ہونے کو ہے
سمندر سے نکلے گہر کس لئے

بہاروں میں کیا اب کے آسیب تھا
لگا مجھ کو پھولوں سے ڈر کس لئے

یہ کیوں آج میں نے تبسم کیا
یہ دیوارِ گریہ میں در کس لئے

نہیں میرے لب پر مرے دل کی بات
ہوا اُس کے دل پر اثر کس لئے

ہمیں ڈھانپ لے اے شبِ سرمدی
یہ پیوندِ نورِ سحر کس لئے

یہ مانا کہ خورشید تیری غزل
بڑی دل نشیں ہے، مگر کس لئے

○

حاصل کو آنسوؤں میں ڈبونا بھی ہے ضرور
اِس کِشتِ نامراد میں بونا بھی ہے ضرور

ہرچند اِس کو پھر سے بکھرنا ضرور ہے
بکھرا ہوا یہ ہار پرونا بھی ہے ضرور

کس جبرِ ہست و بود میں الجھی ہے زندگی
ہونا بھی ہے ضرور، نہ ہونا بھی ہے ضرور

پانے کی دُھن بھی عینِ سرشتِ حیات ہے
پائے ہوئے کو ہاتھ سے کھونا بھی ہے ضرور

ہنسنا بھی ایک جبر ہے اِس سے مفر کہاں
ہنسنے کے بعد بیٹھ کے رونا بھی ہے ضرور

یہ جانتے ہوئے بھی کہ تعبیر کچھ نہیں
اِس سرزمینِ خواب میں سونا بھی ہے ضرور

جنگ آزما ہے اپنے مقدّر سے آدمی
دُھلتا نہیں یہ داغ، پہ دھونا بھی ہے ضرور

توازن

...

مگر نرم رنگین شاخوں پہ یہ جُھولتی نرم رنگین چڑیاں
کڑی سرحدوں کے کڑے پاسبانوں کو
چھو کر گزرتی ہواؤں کے آزاد جھونکے
کُھلی کھیتیوں میں کھلے آسماں کے تلے کچھ کھلے سانس لینے کی مہلت
بڑوں کی لڑائی کے باوصف آپس میں شیروشکر رہنے والے یہ بچے
لڑکپن کے ساتھی سے —— (جو کچھ نہیں بن سکا) —— مل کے دل کا دھڑکنا
کوئی دکھ بھری داستاں پڑھ کے آنکھوں میں آجانے والے یہ آنسو
یہ حسّاس پھولوں کا حسّاس شاخوں پہ انجام سے بے خبر ہو کے کھلنا
یہ کچھ دوستوں کا، صباح و مسا، احمقانہ، مگر بے غرض، ملنا جلنا
خداوندِ عالم کے قدموں میں اپنے تھکے ہارے ماتھے کو رکھ کر
سبک بار ہونے کا احساس ہونا

یہ سب کہہ رہے ہیں۔
ابھی زندگی کو نہ تج،
زندگی اپنے زہروں کا تریاق بھی ہے

○

کل میں اُنہی رستوں سے گزرا تو بہت رویا
سوچی ہوئی باتوں کو سوچا تو بہت رویا

دل میرا ہر اک شے کو آئینہ سمجھتا ہے
ڈھلتے ہوئے سورج کو دیکھا تو بہت رویا

جو شخص نہ رویا تھا تپتی ہوئی راہوں میں
دیوار کے سائے میں بیٹھا تو بہت رویا

آساں تو نہیں اپنی ہستی سے گزر جانا
اترا جو سمندر میں دریا تو بہت رویا

جس موج سے ابھرا تھا اس موج پہ کیا گزری
صحرا میں وہ بادل کا ٹکڑا تو بہت رویا

ہم تیری طبیعت کو خورشید نہیں سمجھے
پتھر نظر آتا تھا، رویا تو بہت رویا

○

دل کا جو معیار تھا کیسا عجب معیار تھا
عقل آتی تھی مگر اِس کو جنوں درکار تھا

بال و پر آمادہ تھے تسخیرِ دنیا کے لئے
دل مگر اِس کُلفتِ بے سود سے بیزار تھا

ہم کو آیا ہی نہیں بزمِ جہاں کا اعتبار
اِس کے ہر اقرار میں پنہاں کوئی انکار تھا

رات کا پچھلا پہر اور دہشتِ دشتِ فلک
سوچ میں ڈوبا ہوا ہر ثابت و سیّار تھا

کل کڑکتی دھوپ میں چلتے ہوئے تیرا خیال
یا ردائے ابر تھی یا سایۂ اشجار تھا

اک نگاہِ واپسیں پر تھم گئی تھی زندگی
نبض ناہموار تھی سورج سرِ کوہسار تھا

اب سے پہلے وہ مری ذات پہ طاری تو نہ تھا
دل میں رہتا تھا مگر خون میں جاری تو نہ تھا

نبض چلتی ہے تو قدموں کی صدا آتی ہے
اس قدر زخمِ جدائی کبھی کاری تو نہ تھا

وہ تو بادل کا برسنا ہے عناصر کا اصول
ورنہ اشکوں کا نمک آنکھ پہ بھاری تو نہ تھا

دل میں کِھلتے ہیں تری یاد کے اعجاز سے پھول
اِس میں کچھ شائبۂ بادِ بہاری تو نہ تھا

یہ بھی اندر کا کوئی روگ ہے ورنہ ہم کو
عمر بھر حوصلۂ نالہ و زاری تو نہ تھا

○

کیوں دلِ زار قدم شوق میں دھرنا کیسا
خاک ہو ہو کے خلاؤں میں بکھرنا کیسا

تیرے تھمنے سے یہ طوفاں تو نہ تھم جائے گا
بادباں تو بھی اٹھا وقت سے ڈرنا کیسا

ایسی پسپائی سے غرقابیٔ جاں اچھی ہے
دل کے چڑھتے ہوئے دریا کا اترنا کیسا

ریزہ ریزہ مری ہستی کو بہا کر لے جا
اے مرے عشق بلا خیز ٹھہرنا کیسا

شاخِ گُل مُہر بلب سوچ رہی ہو جیسے
ہے اگر خاک میں ملنا تو سنورنا کیسا

آنکھ اگر ڈوب کے روئی ہے تو تھمنے کی نہیں
زخم اگر زخمِ تمنا ہے تو بھرنا کیسا

مت جلا پاؤں بھی اِس تشنہ لبی میں خورشید
وادیٔ سنگِ سیہ بخت میں جھرنا کیسا

○

یاد اتری صفتِ خامۂ مانی دل پر
بن گئی پھر وہی تصویر پرانی دل پر

دل ورق تھا ترے پیمانِ محبت کا امیں
پھر گیا سیلِ شب و روز کا پانی دل پر

آئنے کی یہ گواہی ہے کہ وہ دن نہ رہے
سایہ افگن ہے مگر خوابِ جوانی دل پر

اب تو اک عمر سے ہر لحظہ گراں ہے جیسے
دشتِ غربت میں کرے شام گرانی دل پر

اپنے دامن میں لئے ڈوبتے سورج کی مہک
مہرباں ہو کے جھکی رات کی رانی دل پر

تم نے رسماً جسے تحریرِ ہوا سمجھا تھا
لکھ لیا ہم نے وہ پیغامِ زبانی دل پر

بہہ گیا ایک ہی لمحے میں جو منظر خورشید
آج تک ہے اُسی منظر کی روانی دل پر

پگڈنڈی

سبز گوں کھیتوں میں مٹیالی سی پگڈنڈی کا حسن
یہ سحر کے جھٹ پٹے میں ایک نورانی لکیر

اے زمیں کی مانگ! کس افشاں سے بھردوں میں تجھے
اشک برساؤں کہ چُن دوں پھول تا حدِّ نظر
تو افق تک بھی اگر جائے تو کب دھندلائے گی
ساتھ دینے کو مری حدِّ نظر بڑھ جائے گی

○

دلوں میں بارِ یقین و گماں اٹھائے ہوئے
رواں ہے، رختِ سفر کارواں اٹھائے ہوئے

کوئی تو ہے پسِ دیوارِ گلستاں جس کے
نظارہ جُو ہیں شجر، ایڑیاں اٹھائے ہوئے

مری مثال پرانے شجر کی ہے، دل پر
ہزار داغ بہار و خزاں اٹھائے ہوئے

فسونِ صحبتِ شب میں تو نیند ٹلتی رہی
پھروں گا دن کو یہ بارِ گراں اٹھائے ہوئے

ترے خیال کو پھرتا ہوں یوں لئے جیسے
زمین سر پہ پھرے آسماں اٹھائے ہوئے

نہ جانے جسم کے ساحل پہ اب سفینۂ جاں
کس انتظار میں ہے باداباں اٹھائے ہوئے

○

پلٹ کر اشک سوئے چشمِ تر آتا نہیں ہے
یہ وہ بھٹکا مسافر ہے جو گھر آتا نہیں ہے

قفس اب آشیاں ہے خاک پر لکھی ہے روزی
کبھی دل میں خیالِ بال و پر آتا نہیں ہے

پہاڑوں کی سیاہی سے فزوں دل کی سیاہی
وہ حسُن اب اپنی آنکھوں کو نظر آتا نہیں ہے

شجر برسوں سے نقشِ رائگاں بن کر کھڑے ہیں
کوئی موسم ہو، شاخوں میں ثمر آتا نہیں ہے

مرے اِس اوّلیں اشکِ محبت پر نظر کر
یہ موتی سیپ میں پھر عمر بھر آتا نہیں ہے

کوئی قاتل رواں ہے میری شریانوں میں خورشید
جو مجھ کو قتل کرتا ہے نظر آتا نہیں ہے

○

ہوا نہ تیری مہک سے کبھی جدا مرا ہاتھ
چمن چمن ترا دامن صبا صبا مرا ہاتھ

میانِ تیرہ شبی اب بھی یاد آتا ہے
کسی کی ساعدِ سیمیں کو ڈھونڈتا مرا ہاتھ

یہ فیض بھی تو اِنہی ظلمتوں سے پایا ہے
کبھی کبھی مہِ کامل کو جا لگا مرا ہاتھ

مرے لہو سے نہیں، اِس کی بازگشت سے ڈر
خروشِ حشر، ترا دامنِ قبا، مرا ہاتھ

زمیں کے تھامنے والے کرم ہے یہ بھی ترا
دعا کو ہاتھ اٹھایا تو اٹھ گیا مرا ہاتھ

نہیں کہ دل میں مرے مدعا نہیں کوئی
مگر دراز نہیں بہرِ مدعا مرا ہاتھ

جو میرے دل میں ہے خورشیدؔ مجھ کو لکھنا ہے
بلا سے آئے تہِ خنجرِ جفا مرا ہاتھ

○

وہ برگ وہ بار کتنے خوش تھے
مرغانِ بہار کتنے خوش تھے

اب آنکھ کھلی تو سوچتا ہوں
خوابوں کے دیار کتنے خوش تھے

ساحل پہ جس طرح سفینہ
سرکش سرِ دار کتنے خوش تھے

اب گریہ کُناں یہ ابر پارے
کہُسار کے پار کتنے خوش تھے

جب تجھ میں گزر نہ تھا خوشی کا
ہم اے دلِ زار کتنے خوش تھے

تریاق

گاؤں کے اجڑے ہوئے مدفن میں پونم کا طلسم
آج کی تہذیب کے ہر زہر کا تریاق ہے

شہر والوں کے تبسّم کی ریاکاری سے دور
محفلوں کی کھوکھلی سنجیدہ گفتاری سے دور
الجھے الجھے سے دلائل کی گرانباری سے دور

محفلیں لوحِ تکلّف کی وہی پٹتی لکیر
اپنی اپنی چاردیواری کے زنداں میں اسیر
کیا کرے وہ جس کے دل میں وسعتِ آفاق ہے

آ سَحر تک اس دبستانِ حقیقت میں پڑھیں
موت کے بوڑھے معلّم سے کتابِ زندگی

○

چپ رہنا بہتر ہے
یا کہنا بہتر ہے

یا اِسی دوراہے پر
دُکھ سہنا بہتر ہے

اور بہتے لمحوں میں
گھُل بہنا بہتر ہے

کہیں بایاں اچھا ہے
کہیں دہنا بہتر ہے

اب پورے انساں کا
کٹ رہنا بہتر ہے

○

پھر وہ فضا نہیں ملی اُس شبِ مرمریں کے بعد
وہ تری بات کی مہک نکہتِ یاسمیں کے بعد

وہ چمن اور وہ جوئے آب، سلسلۂ خیال و خواب
اور وہ دھواں سا ماہتاب تیرے رخ و جبیں کے بعد

کیا کہوں کیا طلسم تھا شاخ و صبا کے درمیاں
جیسے بدن میں کپکپی بوسۂ اوّلیں کے بعد

موت قبول ہے مگر تلخیٔ لب نہیں قبول
زہر بھی شوق سے پلا، ہاں مگر انگبیں کے بعد

زیرِ نگیں ہوں جب تلک نام کو پوجتے ہیں لوگ
نام کو مانئے، اگر نام رہے نگیں کے بعد

جذبِ زمیں کو چھوڑ کر اُڑ تو چلا ہے آدمی
دیکھئے اب کہاں جمیں اس کے قدم زمیں کے بعد

نورِ یقیں کہیں کہیں، چشمکِ برق کی طرح
وہم و گماں یقیں سے قبل، وہم و گماں یقیں کے بعد

○

دل میں داغ جلے
سرخ چراغ جلے

اتنے پھول کھلے
جیسے باغ جلے

شمع بجھے ساقی
اور ایاغ جلے

دور اندھیرے میں
ایک سراغ جلے

جوں جوں روشن ہو
اور دماغ جلے

○

حوالے جس قدر تھے اب وہ سارے بدلے بدلے ہیں
ہر اک دیکھی ہوئی شے کے اشارے بدلے بدلے ہیں

کسی سے بھی ملیں ٹوٹا ہوا دل لے کے آتے ہیں
کہ جو شعلہ بھی ہے اس کے شرارے بدلے بدلے ہیں

یہ ہم کس سرزمیں میں آ گئے اے قافلے والو !
فلک پہلے سے اونچا ہے ستارے بدلے بدلے ہیں

کلی دل کی کہاں کِھلتی ہے باہر کی بہاروں سے
کہ اب اندر سے سب منظر ہمارے بدلے بدلے ہیں

اِدھر ہے یا اُدھر ہے کوئی چلمن اجنبیّت کی
نظر بدلی ہوئی ہے یا نظارے بدلے بدلے ہیں

افغانستان کے لئے ایک نظم

لو چھٹے[1] سال کی چلمن بھی گری تیرہ و تار
حیرتِ گُنگ مری بول اٹھی آخرِ کار

اپنی آنکھوں سے جو دیکھوں تو نظر آتی ہے
ایک نا راست ترازو سرِ میدانِ وغا
لوگ کہتے ہیں کہ ہے عدل کی میزان بپا

اِس ترازو کا وہ عالم ہے بقولِ شاعر
"جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرمِ ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے"

---

[1] افغانستان پر روسی یلغار کا چھٹا سال

اب کہاں بابر و محمود کی سطوت لیکن
خاکِ فرغانہ و غزنیں سے سوار اٹھتے ہیں
بن کے مہتاب میانِ شبِ تار اٹھتے ہیں
خاک ہو جائیں مگر ہو کے غبار اٹھتے ہیں

○

تم کو مری افتاد کا اندازہ نہیں ہے
تنہائی صلہ ہے مرا خمیازہ نہیں ہے

تم مجھ سے نہ مل پاؤ گے ہرگز کہ مرے گرد
دیوار ہی دیوار ہے دروازہ نہیں ہے

مدّھم ہے نوا میری کسی اور سبب سے
یہ بات نہیں ہے کہ غمِ تازہ نہیں ہے

ہیں شرق سے تا غرب پریشاں مرے ذرّات
جُز موجِ صبا اب کوئی شیرازہ نہیں ہے

جو تیرے لئے ہم پہ کسا جا نہ چکا ہو
اس شہر میں ایسا کوئی آوازہ نہیں ہے

○

بنا رہے کوئی دم، نقشِ پا سے کون کہے
ابھی نہ خاک اڑائے، ہوا سے کون کہے

پئے نشاط نفس دو نفس بچا کے رکھے
یہ مدّعا دل بے مدّعا سے کون کہے

گئی تو بُو ہی نہیں رنگ بھی گلوں سے گیا
پلٹ کے باغ میں آئے صبا سے کون کہے

وہ ملتفت ہیں مگر اب ہمیں دماغ نہیں
کہے ہوئے کو پھر اب ابتدا سے کون کہے

بہت سے روگ دعا مانگنے سے جاتے ہیں
یہ بات خوگرِ رسمِ دوا سے کون کہے

وہ دل کا درد، وہ ناگفتنی سخن خورشید
خدا سے کہہ لیا خلقِ خدا سے کون کہے

○

دیکھ واعظ کو کہ آزادِ گنہ خود بھی نہیں
جس طرح لفظِ ثقاہت کہ ثقہ خود بھی نہیں

آتشِ غیظ بھڑکتی رہی شریانوں میں
اپنے شب خون سے محفوظ سپہ خود بھی نہیں

دم بدم ہم ہی نہ تھے اُس کو منانے والے
ٹھیرتی اُس دلِ نازک میں گرہ خود بھی نہیں

ہے یہ بیداریٔ شب وضع نبھانے کے لئے
ورنہ اب چشمِ طلب، چشم برہ خود بھی نہیں

جانے شاہوں سے یہ کیا مانگتے پھرتے ہیں فقیر
جب فقیری سے تھی حسرت شہِ خود بھی نہیں

شکوہ آئینے سے رکھتی ہیں وہ آنکھیں کہ جنہیں
چشمِ نرگس کی طرح ذوقِ نگہ خود بھی نہیں

جل رہا ہے کسی سائے کی طلب میں خورشید
اپنی حدّت سے ملی اُس کو پنہ خود بھی نہیں

○

اترا ہے ترا ہاتھ مرے دل کے سبو پر
یوں جیسے دھنک پھیل گئی بام کے اوپر

میں تیرے لئے ٹوٹ گیا ذات سے اپنی
تو سے خطِ تنسیخ نہ کھینچا من و تو پر

لوٹی تو ہے کچھ طاقتِ پرواز ہماری
کچھ بادِ بہاری نے کئے تو ہیں رفو پر

میں تیری محبت میں وہ پامال ہوا ہوں
ملتا ہے ترا نقشِ قدم ہر بُنِ مو پر

اِس شدّتِ احساس کا کیا کیجئے خورشید
لہریں سی بناتی ہے صبا میرے لہو پر

○

یہ شہرت ہے کہ رسوائی مگر حد سے زیادہ ہے
میں خود اتنا نہیں، سایہ مرے قد سے زیادہ ہے

مرے دل کی گرہ باتیں بنانے سے نہیں کھلتی
کہ مجھ میں بستگی کچھ قفلِ ابجد سے زیادہ ہے

کسی کے پاس حرفِ دل نشیں باقی نہیں ورنہ
قبول اب بھی دلوں کی خاک میں رد سے زیادہ ہے

سویدا کو مرے نسبت بہت ہے سنگِ اسود سے
مگر نقشِ کفِ پائے محمدؐ سے زیادہ ہے

یہ جانِ ناتواں میری یہ شوقِ بے اماں میرا
توانائی کفِ سیلاب میں سد سے زیادہ ہے

گٹھریاں

صبح کی پہلی کرن رکھتی ہے میرے دوش پر
میلی اُجلی، چھوٹی چھوٹی، موٹی موٹی گٹھریاں
کچھ پرانی کچھ نئی
گٹھریاں جن میں بندھے ہیں لاکھ ناکردہ خیال
کارِ دنیا کے وبال

یہ ہزاروں رنگ کی آپس میں اُلجھی کترنیں
یہ قبائے زندگی کی دھجیاں
منتشر کابوس میرے ناتواں دل پر محیط

دل کہ جس میں بند ہے وہ بقچۂ سربند کتنے سال سے
اَن سلے جس میں ہزاروں پیرہن خوابوں کے ہیں
اطلس و کمخواب و دیبا و حریر

جن کے سینے کی مجھ فرصت نہیں

صبح کی پہلی کرن سے تا شعاعِ واپسینِ شام
میرے پاؤں کی زنجیر ہیں
کترنیں ہی کترنیں اور دھجیاں ہی دھجیاں
سلسلہ جن کا سمٹتا ہی نہیں
لاکھ نپٹاؤں نپٹتا ہی نہیں
میرے سر پر گٹھریوں کا بدنما اہرام
گھٹتا ہی نہیں

ایسا لگتا ہے کہ میں اک سنگِ مقناطیس ہوں
چار سو اُڑتے ہوئے لوہے کے کانٹوں میں اسیر
خالقِ خواب! آمدِ تعبیر کی کوئی نوید
بقچۂ سربند کی کوئی کلید

رباعیات

کھو کر اسے پا جاؤ تو حاصل کہہ لو
منجدھار سے لوٹ آؤ تو ساحل کہہ لو
ہے اپنا سفر اپنے ہی دل سے دل تک
چل پھر کے یہاں آؤ تو منزل کہہ لو

موجوں سے ہراساں نہ کنارے کی تلاش
آنکھوں کو ہے بس آنکھ کے تارے کی تلاش
کچھ عذر ہمیں جان کے دینے میں نہیں
جینا ہے فقط جان سے پیارے کی تلاش

شبنم پہ بھی چل دیدۂ گریاں میں بھی جھانک
اوروں سے بھی مل اپنے گریباں میں بھی جھانک
دو دھارے ہیں اک موج کے جلوت خلوت
آئینہ بھی دیکھ آئنۂ جاں میں بھی جھانک

تھے دید سے غافل ہمیں، ہوں گے تو ضرور
گو آنکھ سے دیکھے نہیں، ہوں گے تو ضرور
سینہ کہ سمندر سے نہیں کم اپنا
سینے میں بھی موتی کہیں، ہوں گے تو ضرور

Scanned by CamScanner

بسم اللہ الرحمن الرحیم
اِمکان

خورشید رضوی

عابد صدّیق کے نام

اے رہ نوردِ عالم بالا چگونہ ای

بپا دل میں پیہم یہ ماتم رہا
مجھے اپنے امکان کا غم رہا

ترتیب

پیش لفظ

شاعری انسان اور کائنات کے رشتے کا ایک اظہار ہی تو ہے۔ سوچنے اور محسوس کرنے والے انسان کا مقدر یہی ہے کہ وہ کائنات کے روبرو اس تحیر اور تفکر' اس بہجت اور سرخوشی' اس حزن و ملال کو وصول کرے جو اس کا مقدر ہے۔ یہی راستہ محسوسات اور وجدان تک جاتا ہے۔ غالب نے کہا تھا:

گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

اور یہ بھی کہہ دیا:

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

کائنات کے ازلی اسرار کو سامنے موجود پا کر اس کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ایک حجاب کے بعد دوسرا حجاب۔ ایک راز کو (اپنی دانست میں) پاکر دوسرے راز کے روبرو ہو کر ششدر رہ جانا کوئی معمولی سعادت نہیں ہے۔ یہ فلسفیوں' مفکروں اور شاعروں کا مقدر ہے۔ یہی داخلی کیفیت محسوساتی سطح پر طبیعت کو وجدان عطا کرتی ہے اور خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو ان محسوسات' اِن داخلی کیفیات اور اِس وجدان کو شعر کے سانچے میں ڈھال لینے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ یہ روحانی تجربہ کیسے لفظوں کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے' اس کا کوئی آسان نسخہ دریافت نہیں ہو سکا۔ یہ کیفیت شعر کا کیا روپ اختیار کرتی ہے' غزل کے سانچے میں ڈھلتی ہے یا نظم کا پیکر استعمال کرتی ہے' یہ داخلی کیفیت کی مجبوری کے علاوہ شاعر کی تربیت' شاعر کی ترجیحات اور اظہار کی قدرت پر منحصر ہے اور غالباً اس امر پر بھی منحصر ہے کہ شاعر کس سرزمین پر اور کس دور میں شعر گوئی کر رہا ہے۔ کیونکہ یہی دو باتیں اس کو ادب کی روایت اور اس کے عہد سے وابستہ کرتی ہیں۔

یہاں ایک ایسے واقعے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو بعض دوستوں کے ہاں بادی النظر میں کوئی خاص معانی نہیں رکھتا یعنی خورشید رضوی صاحب کا لاہور میں قیام۔ دوست کہیں گے اس کا بھلا شاعری سے کیا تعلق ہوا مگر میری دانست میں یہ ایک قابل توجہ امر ہے۔ ہر چند کہ نقادوں اور محققوں نے کبھی دبستانِ لاہور کا لفظ استعمال نہیں کیا لیکن واقع یہی ہے کہ لاہور میں گزشتہ سو برس میں اُردو ادب کی ایک نئی روایت پھولی پھلی ہے۔ یہ روایت اقبال کی شاعری سے ہو کر بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں جدید شاعری کی تخلیق اور فروغ سے ہوتی ہوئی حلقہء اربابِ ذوق کی تربیت گاہ تک پہنچتی ہے۔ یہ ادارہ 1939ء میں قائم ہو گیا تھا۔

اس موقع پر ایک بات اگر زیرِ نظر رہے تو مناسب ہو گا۔ ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا کہ جب لاہور سے مولوی محبوب عالم نے ''پیسہ اخبار'' کا اجرا کیا تو مولانا حالؔی نے انہیں اپنے پیغام میں لکھا:

> ''جو لوگ پنجابی اُردو پر نکتہ چینی کرتے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اُردو زبان ان کے ہاتھوں سے نکل کر پنجاب میں جا رہی ہے۔ اگر یہی سلسلہ مدت تک جاری رہا تو جس طرح عربی زبان عرب سے نکل کر مصر اور شام میں چلی گئی یقیناً وہ وقت دور نہیں ہے کہ دِلی اور لکھنؤ کی بجائے لاہور اُردو کا گھر ہو جائے گا اور اِس طرح ہمیشہ کے لئے اس بحث کا فیصلہ ہو جائے گا''۔

میری ناچیز رائے میں اِس بحث کا فیصلہ تو نہ ہو سکا لیکن مولانا حالی کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔ اِسی لیے میں نے دبستانِ لاہور کی اصطلاح استعمال کرنے کی جرأت کی ہے۔

1938ء کے آتے آتے اقبال کی شاعری تو اُردو شاعری کی کلاسیک میں شامل ہو چکی تھی لیکن اس کے بعد اُردو شعر میں ایک بغاوت کا دور شروع ہوتا ہے جسے اس دور میں جدید شاعری کا نام دیا گیا۔ یہ بغاوت ایک نئی جہت کی تلاش بھی تھی اور بازیافت بھی تھی۔ یہ فیضؔ، راشدؔ اور میرا جی کا دور تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اُردو زبان اور اُردو شاعری کی روایت سے کماحقہٗ واقف تھے۔ یہ بغاوت جہالت نہیں علم کی بنیاد پر ہوئی تھی۔

عجیب اتفاق ہے کہ پچھلے دنوں حلقہء اربابِ ذوق کے 2003ء کے سالانہ جلسے کی

صدارت کا قرعۂ فال خورشید رضوی کے نام پڑا اور انہوں نے اپنے خطبہء صدارت میں یہی بات اِن لفظوں میں کہی۔

''روایت کے سانچے جب فرسودگی میں ڈھلنے لگتے ہیں تو تخلیق کی تازہ کاری انہیں توڑ ڈالنے کی ضرورت بھی محسوس کرتی ہے اور یقیناً اس کا حق بھی رکھتی ہے۔ لیکن اصولی طور پر کسی بھی روایت کو توڑنے یا رد کرنے کے لئے اس کا علم اور اس پر قدرت رکھنا شرط ہے۔ چنانچہ خود روایت شکنی کے لئے روایت کو جاننا اور عملاً اس پر قادر ہونا ضروری ہے۔ اِس علم اور قدرت کے بغیر روایت کے خلاف بغاوت کا نعرہ دراصل اپنی کمزوری کو چھپانے کا ایک بہانہ ہوتا ہے''۔

بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں پنجاب میں جدید شاعری جس بغاوت کی پیغامبر تھی اس کے پیچھے اس عہد کے نئے شاعروں کی اُردو شاعری کی روایت سے پوری واقفیت اور آگہی تھی۔ راشدؔ، فیضؔ اور میراؔجی، جو اِس تحریک کے پیش رو تھے، روایت کی فرسودگی سے واقف نہ ہوتے تو یہ تحریک کامیاب نہ ہوتی۔ نئی نظم اور نئی غزل تخلیق ہونا شروع ہوئی۔ یہ روایت سے قطع تعلق نہیں روایت کو آگے لے جانے کا شعوری عمل تھا جس کے لئے روایت کے فہم کے ساتھ ساتھ کچھ تبدیلیاں بھی لازم تھیں۔ نظم کو قافیے اور ردیف کی قیود سے آزاد کرنا مشکل سہی مگر ممکن بھی تھا۔ البتہ غزل کو ردیف اور قافیے سے آزاد کرنا بے معنی ہوتا۔ دوسری طرف اُردو غزل کے فارم میں وہ جادو تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ غزل تو راشدؔ نے بھی لکھی اور میراؔجی نے بھی لکھی مگر بے دلی سے لکھی۔ مگر جدید اُردو شاعری کے ان بانیوں میں سے ایک شاعر جس نے اُردو غزل کو جدید تر مضامین سے مالا مال کرتے ہوئے ایک نیا لحن عطا کیا وہ فیض احمد فیضؔ تھے۔ ہر چند کہ راشدؔ اور میراؔجی غزل گوئی سے گریزاں رہے لیکن واقع یہی ہے کہ اس تحریک کی برکت سے غزل بطور صنف سخن قائم بھی رہی اور اس پر نئے مضامین اور نئے طرزِ اظہار کے دروازے کھل گئے۔

یہاں اِس دلچسپ سلسلے میں ایک بات عرض کرتا چلوں۔ ن۔م۔ راشدؔ صاحب سے متعلق میرے پاس جو مخطوطے اور مکتوبات محفوظ ہیں ان میں ان کا ایک خط وہ بھی ہے۔ جس پر دو جون

1953ء کی تاریخ درج ہے اور جو نیویارک' امریکہ سے لکھا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایک غزل کہی ہے۔ اس کے چند شعر اِس مختصر سی جگہ میں لکھ رہا ہوں۔ کس قدر Labourd غزل ہے۔ غزل کہنے کے بعد ہمیشہ یہی احساس ہوا۔ الفاظ اور معانی کے بے معنی ہیر پھیر کا احساس۔ قافیہ بازی کی رہنمائی اکثر گمراہی کا باعث ہوئی۔ پیش پا افتادہ فلسفہ کبھی اپنایا نہ جاسکا نہ اپنا کوئی فلسفہ حیات پورے طور پر غزل کے بطن میں راہ پاسکا۔''

دوسری طرف واقع یہ ہے کہ میری دانست میں راشد صاحب کی یہ غزل نہایت اچھی غزل ہے اور بعض شعر تو پڑھتے ہی دل میں اُتر جاتے ہیں لیکن یہ موقع اُس غزل کے تذکرے کے لئے مناسب نہیں۔ ان کا یہ خط غزل کے بارے میں راشد کے خیالات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ راشد صاحب کا بیشتر وقت اس سرزمین سے دُور گزرا۔ پہلے ایران میں اور پھر کئی برس امریکہ میں قیام کیا اور پھر جب یو این او کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو واپس آنے کی بجائے انگلستان کو اپنا گھر بنالیا۔ سال دو سال کے بعد رخصت پر وطن آتے تو ملاقاتیں مختصر اور گفتگو سے لبریز ہوتیں۔ افسوس کہ اِس مضمون پر ان سے گفتگو نہ ہوئی۔ میری ناچیز رائے میں قافیہ تو ایک طلسماتی دروازہ ہے جس سے گزر کر شاعر پر وہ کیفیت اور وہ مضمون وارد ہوتا ہے جس سے وہ خود بھی چند لمحے پہلے تک واقف نہ تھا۔ یہ ایک ذاتی عمل ہے جو بالکل منفرد ہے اور شاعر کی ذات سے وابستہ ہے۔ وہ جو اُردو کے ایک عظیم شاعر نے کہا تھا ''آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں'' غالباً اس کا بھی یہی مفہوم تھا کہ شعر کا مضمون شاعر کی شخصیت کی پُراسرار تہوں میں محفوظ پڑا ہوتا ہے اور ایک لمحہ معرفت میں برآمد ہو کر اس پر وارد ہوتا ہے۔ اس لمحہء معرفت کی ایک کلید تو قافیہ بھی ہے۔ یقین نہ آئے تو آیئے ایک فرضی اور خیالی مشاعرے کا انعقاد کریں۔ یہ ایک طرحی مشاعرہ ہوگا اور اِس میں میر تقی میرؔ' اقبالؔ اور غالبؔ شریک ہیں۔ ردیف تو خیر اپنے آپ کو دہرا کر مسلسل ایک صوتی موسیقی پیدا کرے گی لیکن طرحی مصرعے کے قافیے تو زیادہ سے زیادہ دس بارہ نہیں تو پندرہ بیس ہوں گے لیکن اندازہ کیجئے کہ ایک ہی قافیہ جو مضمون غالبؔ پر وارد کرے گا وہ اس مضمون سے کس قدر مختلف ہوگا جو اقبال پر وارد ہوگا اور میر تقی میرؔ اِسی قافیے کی بدولت جس کیفیت سے دوچار ہو جائیں گے وہ اِن دونوں کے اشعار

سے کس قدر مختلف کیفیت ہوگی۔ یہ سب قافیے ہی کے تو کمالات اور کرشمے ہیں۔ لیکن اگر شاعر روایتی ہے تو قافیہ اس کے لئے جو مضمون اپنے ساتھ لائے گا وہ بھی روایتی ہوگا۔

یہاں پہنچ کر مجھے جدید شاعری کے تذکرے میں میراجی کی ایک تحریر کا خیال آ گیا جو راشد صاحب کے اس خط سے کم وبیش بیس برس پہلے کی ہے۔ میراجی اپنے مضمون بعنوان ''نئی شاعری کی بنیادیں'' میں جو اپریل 1934ء کے شمارہ ''ادبی دنیا'' لاہور میں شائع ہوا' لکھتے ہیں:

''نئی شاعری ہر اس موزوں کلام کو کہا جاسکتا ہے جس میں ہنگامی اثر سے ہٹ کر کسی بات کو محسوس کرنے' سوچنے اور بیان کرنے کا انداز نیا ہو یعنی کوئی شاعر روایتی بندھنوں سے آزاد ہو کر اپنی انفرادیت کو نمایاں کرتا ہے تو وہ نیا شاعر ہے ورنہ پرانا''۔

میراجی کے اس بیان سے یہ واضح ہوگیا کہ نئی شاعری کے سلسلے میں غزل یا نظم کی کوئی قید نہیں۔ صنفِ سخن کوئی بھی ہو امتحان یہی ہے کہ شاعر نے روایتی بندھنوں سے آزاد ہو کر کس حد تک اپنی انفرادیت کو نمایاں کیا۔ میراجی کے اِس امتحان میں فیضؔ سے زیادہ کون سرخرو ہوگا۔ جدید شاعری کے ان بانیوں میں سے میراجی اور راشدؔ نے تو غزل کو ترک کیا اور ان کا شاعرانہ اظہار بیشتر نظم ہی میں محفوظ ہوا لیکن فیضؔ صاحب نے اپنی غزل گوئی سے یہ بات واضح کردی کہ غزل بھی اپنی روایتی بندشوں سے آزاد ہو سکتی ہے۔ فیض نے اپنے قید و بند' اور زندان و سلاسل کے گہرے تجربات کا اظہار غزل میں کچھ ایسے کیا کہ روایتی ترکیبات اور کلاسیکی تصورات نئے معانی سے جگمگا اُٹھے۔ وہی لفظیات' وہی اسلوب جو روایتی شاعروں کے ہاں گھس پٹ کر بے کیف ہو چکا تھا' جب فیضؔ نے اپنے نئے تجربے اور سیاسی نظریے کے اظہار کے لئے استعمال کیا تو اُردو غزل کو ایک نیا اسلوب مل گیا۔

نئی اُردو غزل کے سلسلے میں ایک اور اہم صورت حال ایسی ہے جس پر توجہ کئے بغیر یہ تبدیلی کلی طور پر گرفت میں نہیں آ سکتی۔ جب دبستانِ لاہور نئی نظم اور نئی غزل کی تلاش اور دریافت کے مقام سے گزر رہا تھا تو برصغیر کی اُردو شاعری کے تاریخی مراکز یعنی دلی' لکھنؤ اور

حیدرآباد میں غزل اپنی نئی شان اور نئی چاشنی کے ساتھ فروغ پارہی تھی، داغ دہلوی، فانی بدایونی اور اصغر گونڈوی سے گزر کر اب جگر، جوش، فراق اور یگانہ، گویا ایک پورے کا پورا مکتب اس نئی غزل کی آبیاری کر رہا تھا اور کلاسیکی غزل اب نئی آب وتاب سے جلوہ گری کر رہی تھی۔ اس صورت حال میں ایک مشاہدہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ خورشید رضوی کے گھرانے کی روایت اور رہائش امروہہ سے وابستہ ہے اور وہ خود اپنی روایت اور رہائش کے اعتبار سے لاہور سے وابستہ ہیں۔ اور یوں ان کی غزل گوئی کلاسیکی اور ماڈرن دونوں روایتوں سے فیض یاب ہوئی ہے۔

شہزاد احمد شہزاد کی رائے میں ''خورشید رضوی غزل کے ان شعراء میں سے ہیں جن کی وابستگی جدید علوم سے اتنی ہی گہری ہے جتنی خود، غزل کے کرافٹ سے'' لیکن واقع یہ ہے کہ نئی شاعری کے اس کامیاب تجربے کے بعد اُردو شاعری کی وہ روایت پختہ ہوگئی جس کا آغاز اقبال کر چکے تھے یعنی ایک ہی شاعر غزل گوئی بھی کرسکتا ہے اور نظم نگاری بھی کرسکتا ہے۔ شاعری کا مضمون اور احساساتی تجربہ البتہ اپنی صنف اظہار اپنے ساتھ لائے گا۔ دوسرے لفظوں میں ''مسجد قرطبہ'' نظم کا مضمون ہے غزل کا نہیں۔

اس کے بعد آنے والی نسلوں کے لئے یہ کام آسان ہوگیا۔ آج کا اُردو شاعر چاہے تو مقفّٰی نظم لکھے چاہے تو معرّا اور جب غزل وارد ہو تو اس سے بھی حجاب نہ کرے۔

آج ہمارے درمیان جو احباب اعلیٰ پایے کی قابل توجہ شاعری کر رہے ہیں۔ ان میں ایک مؤقر اور معتبر نام خورشید رضوی ہے۔ جن کے کلام کے تین مجموعے قاری تک پہنچ چکے ہیں۔ اور چوتھا مجموعہ ''امکان'' آپ کے سامنے ہے۔ اس میں ''تہ دل''، ''جزیرہ''، ''مدینہ میں''، ''سالگرہ'' اور ''ہوک'' قابل توجہ نظمیں ہیں۔ توجہ کیجئے تو معانی کے پرت کھلتے چلے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ غزل کا ایک سدابہار گلزار ہے مگر زمین اور مضمون روایتی نہیں ہیں۔ قافیہ جو مضمون اپنے ساتھ لاتا ہے وہ بالکل ذاتی اور منفرد ہے۔ البتہ صنف شعر کے مختلف ہونے کے باوجود اکثر تخلیق کار کے تشخص کی جھلک ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ گویا غزل ہو یا نظم شاعر کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی۔

''حمد'' اس مجموعے کی پہلی نظم ہے جس میں حقیقتِ کاملہ کو ''جانِ تنہائی'' کہا گیا ہے۔ میں نے پڑھا تو سوچ میں پڑ گیا کہ تنہائی تو اِس طرف ہے' کیا اُس طرف بھی تنہائی ہے مگر معانی کے دوسرے ریلے میں خیال آیا کہ تنہائی تو صرف اِدھر ہے اُدھر تو یکتائی ہے اور یکتائی میں غالباً تنہائی نہیں ہوتی۔ دل اس نکتے پر مطمئن ہونے کو تھا کہ چند صفحوں بعد غزل کا یہ شعر سامنے آ گیا:

خدا بھی خلق میں چاہے کہ آئنہ دیکھے
اُسے بھی راس نہ آیا سرورِ یکتائی

تو کیا پہلا خیال ہی درست تھا کہ تنہائی دونوں طرف ہے' اِدھر بھی اور اُدھر بھی۔ مگر اصل چیز تو اِس کائناتِ ہست و بود میں اکیلے انسان کا یہ کمال ہے کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ چند روزہ زندگی حیاتِ مستعار ہے نہ اپنی ذات سے الگ ہو سکتا ہے نہ اسے ترک کر سکتا ہے۔ کیا ہر ایک ذات اس کی عطا کی ہوئی یکتائی ہے۔

یہ اعتماد تو دیکھو بھرے سمندر میں
حباب کھینچ کے بیٹھا حصارِ تنہائی

(کیا اِس مقام پر یہ بات قابل توجہ ہو سکتی ہے کہ خورشید رضوی کے سب سے پہلے مجموعے کا نام ''شاخِ تنہا'' تھا)

ذرا آگے چل کر ایک نظم ہے ''شیشے کی دیوار'' جس کے چار مصرعوں میں اِس خیال کی گونج اِس طرح سنائی دیتی ہے۔

''ذات کا خول بہت پختہ ہے
بے در ' بے روزن
اندر کی باتیں ہیں اندر
باہر کی اُس پار''

اِس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل توجہ نظم ''جزیرہ'' ہے۔

''مری زندگی اب

اَنا کے جزیرے میں سلکرک کی زندگی ہے۔
کوئی لمس، کوئی صدا، کوئی خوشبو، کوئی ذائقہ، کوئی چہرہ شناسا نہیں ہے
سمندر کی نمکین لہروں میں
اپنے ہی چہرے کے بنتے بگڑتے خدوخال سے زندگی میں نمک ہے
مری ناتواں انگلیاں، وقت کی آہنی انگلیوں کے فشارِ مسلسل میں تھکنے لگی ہیں''

''تہِ دل'' ایک بے حد تہ دار نظم ہے جس میں شاعر اپنی ذات کے ہر پہلو سے شناسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ذات جس کے اندر طہارت بھی موجود ہے اور نجاست بھی، یقین بھی موجود ہے اور گمان بھی، یک روئی بھی موجود ہے اور تضاد بھی۔ مگر شاعر اس طہارت سے خوفزدہ ہے:

''جو طہارت چوبِ منبر کو بنائے چوبِ دار
اے تہ دل اس طہارت سے بہت ڈرتا ہوں میں''

شاعر اپنی ذات کی اس نجاست سے بھی ڈرتا ہے:

''جس کا اِک قطرہ
سمندر کو بھی آلودہ کرے''

اور نظم کا خاتمہ اِن مصرعوں پر ہوتا ہے:

''اے تہ دل
اے بلائے جاودانی
اے سیہ ناگوں کے بل
میرے سینے میں گڑی میری صلیب
اے معمائے عجیب''

اور جب یہی ''معمائے عجیب'' غزل میں وارد ہوتا ہے تو کیسا شاندار شعر اپنے ساتھ لاتا ہے۔

دیکھ رہا ہوں دور سے اپنی شبیہِ سربلند
میں نہیں بستہء رسن پھر سرِ دار کون ہے

تو گویا ذات جب اپنے جزیرے سے باہر آتی ہے تو کائنات کا جزو بن جاتی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ نظم اور غزل کے مضامین کا یہ امتزاج تخلیقِ شعر کے پیچھے ذات کی اکائی کا مظہر ہے۔ شاعری کی صنف چاہے بدل جائے، نظم ہو یا غزل، اس کے پیچھے جو شخصیت ہے وہ بہر حال غیر منقسم ہے۔

اب اِس مجموعے میں شامل ایک جاوداں شعر سنا کر اجازت چاہتا ہوں۔

آج بھی بزم میں ہیں رفتہ و آئندہ کے لوگ
ہر زمانے میں ہیں موجود زمانے سارے

اعجاز حسین بٹالوی

لاہور، 28 جولائی 2003ء

حرفِ سپاس

اس مجموعے کے بارے میں مجھے کچھ نہیں کہنا بجز اس کے کہ میں اپنے مشفق و کرم فرما جناب اعجاز حسین بٹالوی کا بہت بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے بے حد مصروف ہونے کے باوجود وقت نکالا اور نہایت مفصل اور فکر انگیز پیش لفظ تحریر فرمایا جو میرے لئے باعثِ اعزاز ہے۔ میرے بیٹے عامر نے ان غزلوں اور نظموں کی بہم آوری میں مدد دی' برادرِ عزیز عابد سیال کے خلوص نے کمپوزنگ کا نقش درست کیا اور برادرم صفدر حسین کی محبت انہیں موجودہ شکل میں آپ تک پہنچانے کا وسیلہ بنی۔ میں ان سب کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

خورشید رضوی

لاہور

۲۲' ستمبر ۲۰۰۳ء

حمد

جانِ تنہائی!
تغیّر کے سمندر میں ترا دستِ دوام
نور کے مینار کی صورت
مِری ڈھارس بندھاتا ہے مُدام

سب گزرتے جا رہے ہیں، کوہ و صحرا، خار و خس
وقت ہے اور اعتبار اور جسم
پے در پے طِلسم
اور اِن کے درمیاں دل
ایک طائر ہے، قفس اندر قفس

تیرے پرتو سے مگر اِس کے لئے ذوقِ یقیں، اِذنِ وجود
تیرا پرتو دمبدم ردِّ طلسمِ دیر و زود
عینِ شب میں صبحِ روشن کی نوید
تیرہ دروازوں کی نورانی کلید
تیرا اِسم

مدینہ میں

کیا حسیں گنبد و محراب ہیں لیکن مرا دل
ڈھونڈتا ہے وہی مٹی کے مکاں
چھت پہ وہی عودِ نخیل
اور دروازوں پہ حجروں کے
سیہ اُون کے موٹے پردے

ڈالنا چاہتا ہوں سر پہ وہی خاکِ ریاضِ جنّت
پے بہ پے جس میں وہ تابندہ قدم آتے تھے
ہائے وہ سادہ سا منبر ہے کہاں
رشک سے جس کے ہوئی گریہ کُناں حنّانہ

میرا دل صورتِ غربال ہے یادوں سے فگار
چھاننا چاہتا ہے خاکِ بقیع
جس میں ہیں اتنے ستارے کہ فلک پر بھی نہیں

اے اُحُد تجھ سے محبت ہے مجھے
اے اُحُد تجھ سے محبت تھی مرے مولاؐ کو
اے اُحُد تجھ کو محبت تھی مرے مولاؐ سے

اے اُحُد آج بھی دامن میں ترے
ہے وہی ہیبتِ حمزہؓ کا جلالِ نفسِ بازپسیں
جیسے اِک شیر کی آنکھ
کِسی رُوبہ پہ ٹھہر جائے حقارت لے کر

شاہراہیں ہیں کہ اژدر ہیں جو نگلے ہوئے ہیں
کتنے نشیب اور فراز
جن سے وابستہ مرا کھویا ہوا حافظہ ہے

مدینہ میں

کیا حسیں گنبد و محراب ہیں لیکن مرا دل
ڈھونڈتا ہے وہی مٹی کے مکاں
چھت پہ وہی عودِ نخیل
اور دروازوں پہ حجروں کے
سیہ اُون کے موٹے پردے

ڈالنا چاہتا ہوں سر پہ وہی خاکِ ریاضِ جنّت
پے بہ پے جس میں وہ تابندہ قدم آتے تھے
ہائے وہ سادہ سا منبر ہے کہاں
رشک سے جس کے ہوئی گریہ کناں حنّانہ

میرا دل صورتِ غربال ہے یادوں سے فگار
چھاننا چاہتا ہے خاکِ بقیع
جس میں ہیں اتنے ستارے کہ فلک پر بھی نہیں

اے اُحُد تجھ سے محبت ہے مجھے
اے اُحُد تجھ سے محبت تھی مِرے مولاؐ کو
اے اُحُد تجھ کو محبت تھی مِرے مولاؐ سے

اے اُحُد آج بھی دامن میں ترے
ہے وہی ہیبتِ حمزہؓ کا جلالِ نفسِ بازپسیں
جیسے اِک شیر کی آنکھ
کِسی رُوبہ پہ ٹھہر جائے حقارت لے کر

شاہراہیں ہیں کہ اژدر ہیں جو نگلے ہوئے ہیں
کتنے نشیب اور فراز
جن سے وابستہ مِرا کھویا ہوا حافظہ ہے

خوں رُلاتی ہے مجھے چشمِ تصوّر کی بھی نابینائی
کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ کہاں کیا کیا تھا
تُف ہے اے چشمِ تصوّر تجھ پر

اشک بہتے ہیں تو بہنے دے کہ اِن آنسوں میں
شاید اُس گزرے ہوئے وقت کی تصویریں ہوں
جو مِرے دل سے گزرتا ہی نہیں

○

سحرِ آئینہ کچھ ایسا ہے کہ ڈر پیدا ہو
بول کچھ بول کہ دیوار میں در پیدا ہو

پھر وہی سلسلۂ نقشِ قدم دِکھلا دے
چشمکِ برقِ رواں ، بارِ دگر پیدا ہو

دل وہ پاگل ہے کہ ہو جائے گا غرقاب وہیں
جھیل کی تہ میں اگر عکسِ قمر پیدا ہو

حُسن ہے حُسن وہی جس کے مقابل آ کر
دیدۂ کور میں بھی تارِ نظر پیدا ہو

ہم نمائش کے تو قائل نہیں لیکن خورشید!
خود کو پنہاں بھی زمانے سے نہ کر ، پیدا ہو

○

کچھ بھی تو نہیں حسرت و حیرت کے علاوہ
آئینے کے اندر ، تری صورت کے علاوہ

جس پھول کو دیکھوں یہی لگتا ہے کہ اِس میں
اِک رنج بھی رہتا ہے ، مسرّت کے علاوہ

ہر جبر سے خاموش گزر آئے کہ افسوس
سر بھی ہمیں درکار تھا ، عزّت کے علاوہ

ہم نے بھی بہت غور کیا رازِ جہاں پر
حکمت نہ کُھلی کوئی ، مشیّت کے علاوہ

جی چاہتا ہے پھر سے مِلیں ، اور دلوں میں
کچھ اور تعلق ہو ، محبت کے علاوہ

○

مئے پنہاں کبھی پیمانے سے باہر بھی دمک
اے غمِ دل! کبھی آنکھوں میں بھی ایک آدھ جھلک

دل میں اِک خوابِ حسیں، ذہن میں اندوہِ معاش
اور دروازے پہ ایّام کی پیہم دستک

زنگ آلود سلاسل کہ جو بج بھی نہ سکیں
پاؤں میں کہنہ زمیں، سر پہ یہ فرسودہ فلک

فن ہے وہ آہوئے وحشی کہ لئے پھرتا ہے
سرِ صحرائے فنا ، خلد کے باغوں کی مہک

ہے کوئی شے مِرے اعماق کے اندر روشن
جس طرح حُجرۂ تاریک میں سونے کی ڈلک

سحر ایسا کہ مسخر کرے گویائی کو
حُسن ایسا کہ پلک سے نہیں لگتی ہے پلک

بجھتی آنکھوں میں اِک اُمّید ابھی کہتی ہے
ڈوبتے دل سے کہ دو چار گھڑی اور دھڑک

ہے تہِ دل میں کہیں ریزۂ الماس ابھی
چشمِ گریاں سے کہو اور چھلک اور چھلک

لب تو خورشید سے کھولے نہ گئے وقتِ وداع
نبض میں رہ گئی جاتے ہوئے قدموں کی دھمک

شہرِ خواب

خوابوں میں بستا ہے کہیں
اِک شہر جو دیکھا نہیں
جِس شہر کی تقدیر پر
افسوس کا سایہ نہ ہو

حاکم ہو ایسا داد رس
چلتا نہ ہو ظالم کا بس
یہ بھی اگر ممکن نہ ہو
تو پنجۂ مظلوم کو
حاصل ہو اتنی دسترس
زنجیر تک آیا کرے
زنجیر ہِل جایا کرے
انصاف مِل جایا کرے

○

صبح سے چاک بھی ہو دامنِ شب ، ضد ہے اُسے
عینِ ماتم میں سجے بزمِ طرب ، ضد ہے اُسے

خود ہر اک بات سے واقف ہے مگر اوروں کو
کچھ نہیں جاننے دیتا ، یہ عجب ضد ہے اُسے

اُس کو سب ایک ہے یوں ، درد و سکوں ، وصل و فراق
ہاں مگر میری تمنا کے سبب ضد ہے اُسے

بات اپنوں کی پکڑ لے تو کہاں چھوڑتا ہے
درگزر غیر سے فرمائے ، تو کب ضد ہے اُسے

سر اگر خم ہے تو محفوظ خمِ تیغ سے ہے
اور اگر زیرِ سپر ہے تو غضب ضد ہے اُسے

سن کے قاصد نے کہا میری دلیلیں خورشیدؔ!
خیر پہلے جو نہیں بھی تھی تو اب ضد ہے اُسے

○

خون سے لکھتا ہوں اور لفظ میں ٹھہراتا ہوں
پھر بھی عکسِ دلِ بے تاب کہاں پاتا ہوں

اے صدائے نہ شنیدہ ، تو کہیں ہو کہ نہ ہو
پا بُریدہ مَیں تِری سمت کھچا آتا ہوں

ہاں مجھے گرمیِ بازار سے کچھ ربط نہیں
جو شکستہ ہو گُہر ، چُن کے اُٹھا لاتا ہوں

صحبتِ اہلِ زمانہ مجھے کیا راس آتی
شور سے بھاگتا ہوں ، زعم سے گھبراتا ہوں

زخم کھاتا ہوں دلِ زار سے باہر خورشیدؔ!
اور پھر کُنجِ دلِ زار میں سستاتا ہوں

○

عالمِ سُکر میں جو کہتا ہوں ، کہنے دے مجھے
میرے اندر تو یہی کچھ ہے ، سو رہنے دے مجھے

آ کبھی لمس کو یکسر نظر انداز کریں
آنکھ سے آنکھ مِلا ، خون میں بہنے دے مجھے

دُور جا کر بھی مِری روح میں موجود نہ رہ
تو کبھی اپنی جدائی بھی تو سہنے دے مجھے

تو مجھے بنتے بگڑتے ہوئے اب غور سے دیکھ
وقت کل چاک پہ رہنے دے ، نہ رہنے دے مجھے

جانِ خورشیدؔ ! مجھے سائے سے محروم نہ رکھ
مَیں گہن میں اگر آتا ہوں تو گہنے دے مجھے

○

وہی موسم ہے، وہی گُل، وہی خوں ریز ہَوا
مار ہی ڈالے نہ ہم کو یہ جنوں خیز ہَوا

دلِ آشفتہ، شجر ہیں، نہ فصیلیں، نہ پہاڑ
کچھ نہیں راہ میں آتی ہے بہت تیز ہَوا

دن کو کرتی ہے کڑی دھوپ چمن کو پامال
شب کو آتی ہے اُڑاتی ہوئی شبدیز ہَوا

دل پہ اب شہرِ خموشاں کی خموشی ہے محیط
کچھ بھی حاصل نہیں اے ولولہ انگیز ہَوا

کہیں منظر نہ بدل جائے یکا یک خورشید
کہیں آندھی میں نہ ڈھل جائے دل آویز ہَوا

○

گُل کھلاتی ہے، کبھی خاک اُڑاتی ہے یہ خاک
شعبدے کرتی ہے، نیرنگ دکھاتی ہے یہ خاک

مَیں تو خود خاک ہوں میرا تو بھلا کیا مذکور
آسمانوں سے ستاروں کو بلاتی ہے یہ خاک

سال ہا سال کھلاتی ہے جسے رزق اپنا
آخرِ کار اُس انسان کو کھاتی ہے یہ خاک

سب سے آخر میں اُبھارے تھے جو رفتہ رفتہ
سب سے پہلے وہ خدوخال مٹاتی ہے یہ خاک

ہے کبھی جسم، کبھی قبر کی مٹّی خورشیدؔ
جس طرف جاؤں، مری راہ میں آتی یہ خاک

شیشے کی دیوار

دل کا دکھ اور سوچ کے دھارے
اب تک ہیں بے کار
پانی میں ہے بند جزیرہ
میان میں ہے تلوار

ذات کا خول بہت پختہ ہے
بے در، بے روزن
اندر کی باتیں ہیں اندر
باہر کی اُس پار

ہونٹ ہلیں، آواز نہ آئے
بات چھپائے، روپ دکھائے
شیشے کی دیوار

○

زمیں کا رزق ہے یا سُوئے آسماں گئی ہے
ہمارے گنبدِ دل کی صدا کہاں گئی ہے

مِلے کہاں سے کہ اب رائگاں نہ ہونے دوں
یہ زندگی تو مِری سخت رائگاں گئی ہے

مَیں دل ہی دل میں نشیمن کی خیر مانگتا ہوں
چمن کی سمت صبا یوں تو مہرباں گئی ہے

گماں یہی تھا کہ اب وہ شبیہِ خون آلود
چلی گئی تہِ دل سے مگر کہاں گئی ہے

یہ سوچتا ہوں بھٹکتی ہوئی نظر اے کاش
وہیں وہیں پہ نہ جاتی جہاں جہاں گئی ہے

ہر ایک شے پہ مجھے اعتبار آنے لگا
یقیں کی لہر بہ اندازۂ گماں گئی ہے

سمجھ نہ خود کو تو اے بحرِ بیکراں تنہا
نظر بھی ساتھ ترے ہو کے بے کراں گئی ہے

ہزار ساعتِ آئندہ خون روتی ہے
یہ چشمِ نم جو کبھی سوئے رفتگاں گئی ہے

یہ موج ، اس کو چٹانوں پہ سر پٹکنا ہے
جو آبشار کی جانب رواں دواں گئی ہے

ہر ایک نیند میں ڈوبے ہوئے شبستاں تک
بلا سے کوئی نہ جاگے ، مگر اذاں گئی ہے

○

ہَوا کے زور پہ چلنا بھی چاہیے کچھ کچھ
مگر ہَوا کو بدلنا بھی چاہیے کچھ کچھ

بجا کہ خوب ہے یہ سحرِ چشم و آئینہ
اب ان حدوں سے نکلنا بھی چاہیے کچھ کچھ

گُہر جو خواب کے آسودہ ہیں تہِ دل میں
اِنھیں تہوں سے اچھلنا بھی چاہیے کچھ کچھ

زمانے کو جو ہمیں ڈھالتا رہا ہے سدا
ہمارے رنگ میں ڈھلنا بھی چاہیے کچھ کچھ

جما ہُوا ہے لہو تہ بہ تہ رگِ جاں میں
ہمیں لہُو یہ اگلنا بھی چاہیے کچھ کچھ

○

کہیں بھی مقامِ صدائے لب نہیں آ سکا
مَیں تری صدائے نگہ پہ کب نہیں آ سکا

ترے ہجر، تیرے وصال، اپنے خیال میں
کسی آئنے میں، مَیں سب کا سب نہیں آ سکا

ترے قرب میں مجھے موت یاد نہیں رہی
وہ سحر ہوئی کہ خیالِ شب نہیں آ سکا

جو تمام عمر رہا سبب کی تلاش میں
وہ تری نگاہ میں بے سبب نہیں آ سکا

ہوئی ایسے سایۂ رنج میں مری تربیت
کبھی کوئی وسوسۂ طرب نہیں آ سکا

یہ مری متاعِ گراں ہَوا میں بکھر گئی
مجھے اپنے سوزِ نہاں کا ڈھب نہیں آ سکا

○

حیراں ہوں مَیں کیونکر سفرِ خاک سے گزرا
شعلہ سا سمٹتا ہُوا خاشاک سے گزرا

ہر دیکھنے والے کا مقدر یہی حیرت
ہر سوچنے والا اِسی پیچاک سے گزرا

آلائشِ دنیا میں ٹھہرنے نہیں پایا
منظر جو نواحِ نگہِ پاک سے گزرا

اب لطفِ سخن ہو کے کھِلے گا ترے لب پر
وہ پھول جو رنگینیٔ پوشاک سے گزرا

اے گردشِ ایّام مرے دل پہ نظر کر
ایسا بھی کوئی جام، ترے چاک سے گزرا

اے خالقِ امکاں ترے زندانِ قضا میں
کیا کیا نہ ہمارے دلِ غم ناک سے گزرا

جب انجمِ افلاک اترتے تھے زمیں پر
مَیں گرد ہُوا اور سرِ افلاک سے گزرا

تہِ دل

اے تہِ دل
رونمائی سے تری ڈرتا ہوں مَیں
اے تہِ دل
تو کنواں ہے اور مَیں یوسف ہوں
کچھ مایوس، کچھ مانوس
تیرے بطن میں
تیرے سوتوں سے کہیں زہراب رِستا ہے
کہیں آبِ حیات

اے تہِ دل

تجھ میں ہے کتنی طہارت

تجھ میں ہے کیسی نجاست

تجھ میں ہیں کتنے گماں، کتنے یقیں

کتنے تضاد

اے تہِ دل، رونمائی سے تری ڈرتا ہوں مَیں

اے تہِ دل

تجھ میں ہے کتنی طہارت

اہلِ ظاہر جس کی تابانی کے آگے خیرہ چشم

اہلِ فتویٰ جس کے آئینے کے آگے روسیاہ

جو طہارت چوبِ منبر کو بنائے چوبِ دار

اے تہِ دل اُس طہارت سے بہت ڈرتا ہوں مَیں

اے تہِ دل

تجھ میں ہے کیسی نجاست

جس کا اِک قطرہ

سمندر کو بھی آلودہ کرے

اہلِ ظاہر کی صدائے آفریں کے باوجود
جس کی آمیزش سے لگتا ہے مجھے
حُسنِ عمل، کارِ گناہ
اے تہِ دل، اُس نجاست سے بہت ڈرتا ہوں مَیں

اے تہِ دل
اے بلائے جاودانی
اے سیہ ناگوں کے بِل
میرے سینے میں گڑی میری صلیب
اے معمائے عجیب

○

جذبے کی کوئی شکل بنانی ہی پڑے گی
سونے میں مجھے کھوٹ ملانی ہی پڑے گی

یوں لاکھ رہیں جادۂ لذّت پہ سبک گام
آخر کو مگر دل پہ گرانی ہی پڑے گی

گو دست کشی دل کو سہاروں سے بہت ہے
ڈوبے گی تو یہ نبض دکھانی ہی پڑے گی

ہر ایک بلا سر پہ ہمارے صفتِ زیست
جب آن پڑے گی تو اُٹھانی ہی پڑے گی

ہم کھوئے ہوئے لوگوں کو ڈھونڈے گا بھلا کون
اب اپنی خبر خود ہمیں لانی ہی پڑے گی

آزار یہ پہلو سے نکل جائے تو اچھا
دل ہو گا تو پھر چوٹ بھی کھانی ہی پڑے گی

خورشیدؔ غزل تم یہ سرِ بزم سنا دو
کچھ اور نہیں ، طرحِ روانی ہی پڑے گی

○

بپا دلِ میں پیہم یہ ماتم رہا
مجھے اپنے امکان کا غم رہا

حسیں جنتوں سے گزرتے ہوئے
مِرے ساتھ میرا جہنّم رہا

مجھے رونقِ بزم سمجھا گیا
مگر بزم میں مَیں بہت کم رہا

دلوں پر وہی زنگِ فرسودگی
وہی شکوۂ دہر باہم رہا

ہوئی بات جب بھی کوئی لازوال
بہت دیر تک وقت برہم رہا

ہوئے رنگ اور لفظ گردِ سفر
رہا تو بس اِک دیدۂ نم رہا

نہیں چھو سکے آسماں کو تو کیا
ارادہ تو دل میں مصمّم رہا

○

بادل سرِ آسماں رواں ہے
اور دل میں خیالِ رفتگاں ہے

ہے یوں تو گراں ہی زندگانی
پر آج کی شب بہت گراں ہے

کچھ بار ہے لطفِ دشمناں کا
کچھ رنجِ جفائے دوستاں ہے

ہے دار پہ حلقۂ رسن تنگ
اور موج میں طبعِ سرکشاں ہے

ہم وقت کے پار جا رہے ہیں
اے عمرِ گزشتہ تُو کہاں ہے

آغوش میں لے سکوں تو جانوں
وہ کیا ہے، جسم ہے کہ جاں ہے

یا کوہِ گراں سُبک ہے دل پر
یا پھول کی پنکھڑی گراں ہے

جزیرہ

مِری زندگی اب
انا کے جزیرے میں سلکرک☆ کی زندگی ہے
کوئی لمس، کوئی صدا، کوئی خوشبو، کوئی ذائقہ، کوئی چہرہ
شناسا نہیں ہے
سمندر کی نمکین لہروں میں
اپنے ہی چہرے کے بنتے بگڑتے خدوخال سے
زندگی میں نمک ہے
مِری ناتواں انگلیاں، وقت کی آہنی انگلیوں کے
فشارِ مسلسل میں تھکنے لگی ہیں

ازل سے یہ بگڑی ترازو
یہ انسان کا وقت سے نامساوی تصادم
مشیت کا اِک جبر ہے، حُسنِ ظن ہے، تماشا ہے،
کیا ہے؟

زمانوں جہانوں پہ پھیلے کسی کے ارادے
ہمارے دُکھی دل کے قرطاس پر کتنے زخموں کی تحریر
لکھتے رہے ہیں

اسی رسمِ افسوس میں
مَیں فسردہ بھی ہوں وقت سے پنجہ افگن
سمندر سے اٹھ کر سمندر میں غرقاب ہوتے ہوئے
سورجوں اور ستاروں کی تسبیح کو گن رہا ہوں

انھی سورجوں اور ستاروں کی لَو پر
دمک اٹھے شاید وہ بھٹکا سفینہ
جو میری کھلی آنکھ کے خواب کی سرد اور زرد محراب میں
سُرخ روشن دیا ہے

✡ سکاٹ لینڈ کا ملاح Alexander Selkirk (۱۶۷۶ء - ۱۷۲۱ء) جو چار سال چار ماہ ایک دور افتادہ جزیرے پر تنہا رہا۔ ڈیفو کے "روبنسن کروزو" کا کردار اُسی کی شخصیت سے ماخوذ ہے۔ ولیم کوپر نے اُس کی تنہائی پر ایک یادگار نظم لکھی ہے۔

○

سماں غروب کا دل میں رہا ابھرتے ہوئے
خیال خاک میں ملنے کا تھا، سنورتے ہوئے

زمیں اداس ہے اور آسماں پہ، خندہ گناں
گزر رہے ہیں ستارے اداس کرتے ہوئے

بکھر گیا تو مجھے کوئی غم نہیں اس کا
کہ راز مجھ پہ کئی وا ہوئے، بکھرتے ہوئے

فسردہ اتنی ہے اس بار رہگزارِ خیال
خرامِ یار جھجکتا ہے گُل کترتے ہوئے

مجھے بھی اپنا دلِ رفتہ یاد آتا ہے
کبھی کبھی، کِسی بازار سے گزرتے ہوئے

زمانہ لب پہ یہ انگشت رکھ کے کہتا ہے
کہ دردِ دل نہ کہو اور کہو تو ڈرتے ہوئے

لبوں سے نیم تبسم بھی اُٹھ گیا خورشیدؔ
اداسیوں کا مداوا تلاش کرتے ہوئے

○

حیران ہیں اہلِ دل خدایا
کیا تُو نے یہ سلسلہ بنایا

جس چیز پہ شوق سے نظر کی
اس چیز نے ہم سے منہ چھپایا

جو صفحۂ دہر پر نہیں تھا
کیوں خواب میں وہ چمن دکھایا

کانٹوں نے پاؤں میں خلش کی
پھولوں کی طلب نے دل دُکھایا

مَیں قریۂ خواب کا مسافر
تعبیر میں کون کھینچ لایا

○

صرفِ خزاں ہیں کس کے رنگ ، وجہِ بہار کون ہے
ابلقِ صبح و شام کا شاہسوار کون ہے

دیکھ رہا ہوں دُور سے اپنی شبیہہِ سربلند
مَیں نہیں بستۂ رسن ، پھر سرِ دار کون ہے

وہ تو جہاں گیا تیرگیاں رہیں نہیں
نُور کو کیا خبر ، کہاں ، تیرہ و تار کون ہے

کچھ نہ کھلا کہ راز کیا سلسلۂ سخن میں ہے
حرف کے اِس طرف ہوں مَیں ، حرف کے پار کون ہے

مجھ کو بھی کچھ بتا کہ تُو ، کس سے ہے محوِ گفتگو
اے دلِ زار کون ہے ، اے دلِ زار کون ہے

○

زہراب ہوں مَیں یا قند ہوں مَیں
یا دونوں کا پیوند ہوں مَیں

خوشبو سے چٹخ جاؤں نہ کہیں
نافے کی طرح سر بند ہوں مَیں

بدحال سہی ، شہزادہ ہوں
پامال سہی ، الوند ہوں مَیں

مِرا ذرّہ ذرّہ جاگتا ہے
بغداد ہوں مَیں ، سرہند ہوں مَیں

مَیں تیری سمجھ میں کیا آتا
آزادۂ چون و چند ہوں مَیں

مَر جانے کی شرطیں سوچ کے رکھ
وعدے کا بہت پابند ہوں مَیں

مُدّت میں مِلے اور اتنا کہا
آباد ہوں مَیں ، خورسند ہوں مَیں

○

دل کو پیہم وہی اندوہ شماری کرنا
ایک ساعت کو شب و روز پہ طاری کرنا

اب وہ آنکھیں نہیں مِلتیں کہ جنھیں آتا تھا
خاک سے دل جو اَٹے ہوں انھیں جاری کرنا

موت کی ایک علامت ہے، اگر دیکھا جائے
رُوح کا چار عناصر پہ سواری کرنا

تُو کہاں مرغِ چمن ، فکرِ نشیمن میں پڑا
کہ تِرا کام تو تھا نالہ و زاری کرنا

ہوں مَیں وہ لالۂ صحرا کہ ہُوا میرے سپرد
دشت میں پیرویٔ بادِ بہاری کرنا

اس سے پہلے کہ یہ سودا مِرے سر میں نہ رہے
دستِ قاتل کو عطا ضربتِ کاری کرنا

یہ جو ٹپکا ہے زباں پر سو کرم ہے یہ تِرا
اب رگ و پے میں اسے جاری و ساری کرنا

بخشنا لعل و جواہر سے سوا تابِ سخن
خاک کو انجمِ افلاک پہ بھاری کرنا

ہُوک

جب کتابوں کے نوشتوں سے پھسل کر
مِری درماندہ نگاہ
چارسُو پھیلے ہوئے صفحۂ ایام پہ جا پڑتی ہے
دل میں اِک ہوک سی اٹھتی ہے
ابھر آتے ہیں دکھتے ہوئے جانکاہ سوال
پھر اسی ہوک کے لہجے میں خدا بولتا ہے

"زندگانی کی کڑی شرطیں ہیں
یہ عبادت ہے تمھاری کہ مِرے بخشے ہوئے دکھ جھیلو
ان پرندوں کا، بہائم کا تصوّف دیکھو

کیسے منقار شکستہ طائر
دانے دانے کو ترس جاتا ہے دانوں میں گھِرا
مشتِ پر خاک میں ڈھل جاتی ہے رفتہ رفتہ
جان کھو دینے کے بے زار ارادے کے بغیر
کِسی شکوے کے بغیر"

اور یہ مجھ سے بڑا درس سمجھ میں نہیں آتا میری
کِس لئے اُس کی مشیت نے کیا دکھ پیدا
سوچتا ہوں تو ڈھلک آتے ہیں اشکوں میں سوال
ہے مِری سوچ مِرے اپنے لئے ایک عذاب
اُس پہ عائد ہی نہیں میرے سوالوں کا جواب

○

فرصت ہی نہ تھی نغمۂ تارِ رگِ جاں سے
ہنگامۂ دنیا کو سُنا گوشِ گراں سے

اے حسرتِ خوش فہم، ترے وہم بھی ہیں خوب
خوشبوئے بہار آنے لگی بادِ خزاں سے

جس طرح سمندر سے گزرتا ہے سفینہ
مجھ کو بھی گزرنا ہے جہانِ گزراں سے

تھمنے سے مِرے سیلِ زمانہ نہیں تھمتا
دنیا ہے روانی میں ، الگ عمرِ رواں سے

کُھلتا ہے کوئی راز تو رہ جاتا ہوں حیران
پوشیدہ ہے کیا کیا مِری چشمِ نگراں سے

مٹّی میں تو رنگوں کے خزانے نہیں ہوتے
کیوں ، اے گُلِ نورُستہ ، تُو آیا ہے کہاں سے

بے درد ہیں اور درد سنانے پہ ہے اصرار
کچھ دل میں نہیں اور شکایت ہے زباں سے

Scanned by CamScanner

○

اے دردِ نہاں مار ہی ڈالا مجھے آخر
اِس رنج سے باہر نہ نکالا مجھے آخر

کب تک عملِ گریہ رہا کچھ نہیں معلوم
خود میری طبیعت نے سنبھالا مجھے آخر

ہستی مِری خود میری تہِ دل میں تھی معدوم
گرداب کی گردش نے اُچھالا مجھے آخر

پھولوں سے، ستاروں سے، شراروں سے گزارا
اک شعلۂ بے تاب میں ڈھالا مجھے آخر

ڈرتا ہوں بہت روشنیِ طبع سے خورشید
اندھا ہی نہ کر دے یہ اجالا مجھے آخر

○

مَیں ہوں خود سے بھی خفا، مجھ کو لبھائے نہ کوئی
مہرباں ہو کے کبھی پاس بُلائے نہ کوئی

وقت ہر دور میں تھا دل کی امنگوں کا رقیب
فیض اس پیرِ جواں بخت سے پائے نہ کوئی

ایک تصویر جو ہو مائلِ تصویرِ دگر
ساتھ ساتھ ان کو زمانے میں سجائے نہ کوئی

ہاں وہی دشت، وہی گم شدگی اچھی تھی
اب کے بھٹکوں تو مجھے راہ پہ لائے نہ کوئی

مَیں کِسی راز کا پردہ نہیں ہونے پاتا
پردہ کرنا ہو تو پھر مجھ میں سمائے نہ کوئی

○

حسرت ہے نظر کو کہ نظر آئیں پرندے
معدوم تو منظر سے نہ ہو جائیں پرندے

چلتے ہوں تو قدموں میں بچھا جاتا ہو سبزہ
شاخیں کہیں لہرائیں، کہیں گائیں پرندے

اُن کانپتی پلکوں میں وہ نم ہوتی ہوئی آنکھ
یوں جیسے کِسی جھیل پہ منڈلائیں پرندے

وہ آگ برستی ہے کہ کتراتے ہیں دریا
وہ حبس کہ اڑتے ہوئے گھبرائیں پرندے

ویراں ہیں شجر اور گھروں میں نہیں آنگن
اے کشمکشِ رزق کہاں جائیں پرندے

تا حدِ نظر دام کہ دانہ نہیں جس میں
ہیرے کی کنی عام، اگر کھائیں پرندے

آرامِ قفس وہ کہ نشیمن نہ رہے یاد
چاکِ قفس ایسا کہ گزر آئیں پرندے

○

جھیل گیا تمام زور ، یورشِ ماہ و سال کا
روپ ترے خیال کا ، رنگ مرے ملال کا

ہم سخنی سے آدمی ، ہمسرِ ہمنشیں نہیں
صحبتِ روز و شب میں ہے فصل ہزار سال کا

عینِ وصال میں سہی ، ایک سے حال میں سہی
ایک سے حال میں مگر فرق بہت ہے حال کا

ہے مرے سینے میں کہیں ایک خروشِ بے نمود
سوئے ہوئے پہاڑ میں اٹھتے ہوئے ابال کا

اُس کو کسی سے کیا غرض جس دلِ بے نیاز کو
شوق نہ ہو عروج کا خوف نہ ہو زوال کا

ہے کبھی میرا سنگِ میل اور کبھی میری گردِ راہ
دل کہ نہیں ہے راہ رَو جادۂ اعتدال کا

○

وہی بہار وہی شغلِ باد پیمائی
وہی خیال وہی اُس کی بے سروپائی

کُھلے ہوئے ہیں دریچے ہر ایک سمت مگر
کِسی طرف سے کچھ اپنی خبر نہیں آئی

محبتیں بھی کیں ، اور نفرتیں بھی کیں
نہ آدمی نے مگر آدمی کی تہ پائی

یہ اعتماد تو دیکھو بھرے سمندر میں
حباب کھینچ کے بیٹھا حصارِ تنہائی

تم اپنے آپ میں گُم تھے تو ایک عالم تھا
بُرے کو دھیان پڑا ذوقِ عالم آرائی

زمانے کا مِرے خوابوں پہ کچھ اثر نہ ہوا
وہی نکھار وہی تازگی و رعنائی

خدا بھی خلق میں چاہے کہ آئنہ دیکھے
اُسے بھی راس نہ آیا سرورِ یکتائی

○

وقت ہجرت کا ہے ہجرت کی زمیں نامعلوم
کس مکاں کا ہو دلِ زار مکیں نامعلوم

ثبت پتھر پہ ہو دیکھیں کہ ہوا میں اُڑ جائے
یہ مِرا نام کہ ہے جس کا نگیں نامعلوم

خواب میں دیکھ لیا کھو دیا بیداری میں
کہیں معلوم ہے تُو اور کہیں نامعلوم

جتنے اسبابِ طرب دہر میں ہیں سب موجود
کیا تقاضا ہے ترا طبعِ حزیں نامعلوم

گونج اپنی ہے کہ آتا ہے سوالوں کا جواب
اس خرابے میں کوئی ہے کہ نہیں نامعلوم

کِس کو دوں اپنی طبیعت کی وراثت خورشیدؔ
اِک امانت ہے مِرے پاس امیں نامعلوم

انقلاب

کیا کھرے کھوٹے میں رکھا ہے
کہ سکّہ تو چلن کا نام ہے
اس قدر پایا غل و غش نے فروغ
صیرفی آخر بدلوانے لگے اپنے محک، اپنے عیار
مَیں زرِ خالص ہوں، ہر بازار میں مشکوک ہوں
یہ کھرا ہونا بھی ہے کیسا عذاب
انقلاب، اے انقلاب

سالگرہ

جیسے اِک سانپ ہے ڈستا ہے مجھے سال بہ سال
جب پلٹ کر وہی موسم وہی دن آتا ہے
پھولنے لگتا ہے مجھ میں وہی مسموم خمیر
اُس کا بوسہ مِری پوروں میں مہک اٹھتا ہے

اور وہ اپنی ہی خوشبو کی کشش سے بے چین
مَیں کہیں بھی ہوں، مِرے پاس چلا آتا ہے
در و دیوار اُسے راستہ دے دیتے ہیں
اور مَیں اُس کی طرف ہاتھ بڑھا دیتا ہوں

نیل بڑھتے چلے جاتے ہیں مگر چارہ نہیں
ہے مِری زیست کی تصدیق یہی زہر کی مُہر
جس سے انکار کی قیمت ہے مِرا اپنا وجود

○

ماضی کو بھی دیکھیں گے اب اپنی ہی نظر سے
اِس کی بھی خبر کچھ نہ مِلی ، اہلِ خبر سے

کچھ گُم ہوئے اوراق روایت میں نہ آ کر
کچھ مسخ ہوئے حُسنِ روایت کے اثر سے

فرسودگیٔ رنگِ گلستاں سے ہُوں بیزار
اُکتایا ہُوا برگ و بر و شاخ و ثمر سے

آئے تو سہی سامنے وہ عکسِ گریزاں
آنکھیں بھی نہ جھپکوں گا گزر جانے کے ڈر سے

گردش میں ہیں سب دشت و دیار و در و دیوار
وہ بھی ہیں سفر میں کہ جو نکلے نہیں گھر سے

فارغ نہیں مَیں خود سے کہ رہتا ہے شب و روز
آشوب مرے دِل میں مرے فتنۂ سر سے

○

خیالات لفظوں میں ڈھالے بہت
بنائے پہاڑوں کے گالے بہت

کشش نے تری اے جبینِ نیاز
صنم پتھّروں سے نکالے بہت

زمیں کا سفر بے جہت ہے تو کیا
کتابِ فلک کے حوالے بہت

شبِ تیرہ میں ہو کوئی دستگیر
سحر ہوتے ہوتے اُجالے بہت

نہیں گوہرِ دل کی کوئی نظیر
سمندر جنوں نے کھنگالے بہت

ہر اِک لمحہ ہے ایک کوہِ ندا
بلاوے بہت آنے والے بہت

سمٹتا نہیں خواہشوں کا سفر
مسافت ہے کم اور چھالے بہت

Scanned by CamScanner

○

کہیں شطرنج کے خانے ستارے
کہیں تسبیح کے دانے ستارے

ہم آغوشی ، سحر تک ، ظلمتوں نے
بہت چاہی ، نہیں مانے ستارے

زمیں پر اجنبی صدیوں کی یلغار
فلک پر جانے پہچانے ستارے

یہ لشکر ، یہ الاؤ ، یہ خم و پیچ
چلے ہیں کِس سے ٹکرانے ستارے

سراسر بے نیازِ مطلعِ صبح
رواں رہتے ہیں دیوانے ستارے

○

ہم اِس دشت سے کیوں گزارے گئے
کہاں بال و پر وہ ہمارے گئے

رہا اِس سے آگے سہاروں کا وہم
قدم دو قدم تک سہارے گئے

تہِ خاک سب مسند آرائے خاک
اکیلے اکیلے اُتارے گئے

نہ تھا تیرگی میں کوئی ہم سفر
فقط ہم گئے یا ستارے گئے

ذرا دُور پر روشنی بھی رہی
مگر ہم اندھیرے میں مارے گئے

○

پیڑ ہلے کس لئے
پھول کھلے کس لئے

کھل اٹھے غنچے تو پھر
ہونٹ سلے کس لئے

دستِ صبا نرم تھا
زخم چھلے کس لئے

وہ جو مِلے صبح و شام
پھر نہ مِلے کِس لئے

لب پہ تبسّم ہے کیوں
دِل میں گِلے کِس لئے

مانگنے لگتا ہے دِل
غم کے صِلے کِس لئے

○

کام بڑے رہ گئے
دِل میں گڑے رہ گئے

دید کی فرصت نہ تھی
خواب پڑے رہ گئے

ختم سفر ہو گیا
کوس کڑے ، رہ گئے

آنکھ کھلی رہ گئی
عکس جڑے رہ گئے

جا کے نہ آئی ہَوا
پیڑ کھڑے رہ گئے

بات پہ اپنی اَڑے
اور اَڑے رہ گئے

○

نہ موجِ بادِ صبا گُل کھِلانے آئے گی
نہ اب چمن میں خزاں خاک اُڑانے آئے گی

نکل گیا ہے سفینہ کُھلے سمندر میں
نہ کوئی غم نہ خوشی دِل دُکھانے آئے گی

وفائے یار سے بھی بے نیاز ہے اب دِل
جفائے یار بھی کیا مُنہ دِکھانے آئے گی

غرض حیات کے سب امتحان ختم ہوئے
بس اب تو موت مجھے آزمانے آئے گی

وہ جاں کنی کی کم آمیز نیلگوں ساعت
دبے قدم جو کسی دن سرہانے آئے گی

وہ اپنے سرد لبوں کے اُداس بوسے سے
مِرے لہو کی حرارت چُرانے آئے گی

بس ایک لمحۂ لرزاں میں اختصار کے ساتھ
وہ عمر بھر کی کہانی سنانے آئے گی

○

پوشیدہ ہے تہوں میں پھرتی ہے ساحلوں میں
اِک آگ سی رواں ہے ہر سمت پانیوں میں

چیتے کی جست جیسے، اِک چشمِ مست جیسے
کیا کیا خیال آئے جنگل کی بارشوں میں

پو پھوٹتے ہی دوڑا چاندی کا حاشیہ سا
جلتے ہوئے دِیوں کی بجھتی ہوئی لووں میں

وہ آگیا تو جیسے سبزے میں جان آئی
دوڑی رمق ہَوا کی ساکت صنوبروں میں

کچھ زخم رہ گئے ہیں، شعلہ سے، دل کے اندر
کچھ درد بہہ گیا ہے، پانی سا، آنسوؤں میں

لرزاں ہے شاخِ دل پر اِک یاد کا نشیمن
تپتے ہوئے دنوں کی مہکی ہوئی شبوں میں

شاید اِسی لئے ہے شوریدگی زیادہ
آنے لگا سمندر گھٹ کے ندّیوں میں

کب زندگی ہوئی ہے اُس کے اثر سے خالی
رہتا ہے وہ ابھی تک اندر کے ولولوں میں

رفتارِ آسماں میں کوئی کجی نہیں ہے
ساری کجی نہاں ہے آنکھوں کے زاویوں میں

اے اشکِ غم بچھر کر یہ بام و دَر ہِلا دے
کب تک پڑا رہے گا، دُکھتے ہوئے دِلوں میں

دِل سمجھتا ہے

چمنِ زیست میں ہیں فصلِ خزاں کے آثار
وقت کہتا ہے کہ تم کل بھی تھے گرد آج بھی ہو
دل سمجھتا ہے کہ اب گرد بھی کب باقی ہے
اب تو شریانوں سے تھم تھم کے گزرتا ہے لہو
آہ یہ میرا دلِ زار یہ بڑھتا ہُوا بوجھ
بھول جانے کی سہولت جِسے حاصل ہی نہیں

غوّاص

مَیں کیسا عجیب آدمی ہوں
اَن دیکھے سمندروں کا غوّاص
سنسان تہوں میں سانس روکے
مٹھی میں دبائے گوہرِ خاص
جب سطح پہ آنکھ کھولتا ہوں
مبہوت خلا میں بولتا ہوں

○

جب یاد کے سائے میں ستائے فراموشی
تصویر بھی دیکھوں تو یاد آئے فراموشی

آنکھوں کو شکایت تھی یادوں کے عذابوں سے
اب دیکھئے جو کچھ بھی دکھلائے فراموشی

دو دن کو ہے یہ سارا ہنگامہ من و تُو کا
ہر نقش بہا دے گا دریائے فراموشی

اُس دِل کے بھی ہو شاید باقی کِسی گوشے میں
اِک یاد جِسے کہیے ، ہمتائے فراموشی

معمورۂ ہستی میں ہر شے کا مقدر ہے
امروزِ شناسائی ، فردائے فراموشی

ہر بام کے ماتھے پر فرمانِ فنا کندہ
ہر یاد کے باطن میں ایمائے فراموشی

جو خاک نشانی تھی اِک صورتِ پنہاں کی
اب وہ بھی پریشاں ہے ، اے وائے فراموشی

پوچھو نہ خبر اس سے گُم گشتہ بہاروں کی
ہے طائرِ دِل وقفِ سرمائے فراموشی

خورشید ، سُنا تُو نے اُس بزم میں کل تیرا
وہ ذکر ہُوا جس سے شرمائے فراموشی

○

وہ مجھے خاک سے باہر نہیں جانے دیتے
دستِ ساحل سے سمندر نہیں جانے دیتے

سطح پر آئے ہوئے بن کے کف و موج و حباب
زیرِ دریا یہی گوہر نہیں جانے دیتے

ہیں مِری راہ کا پتھّر ، مِری آنکھوں کا حجاب
زخم باہر کے جو اندر نہیں جانے دیتے

مجھ کو اِس گنبدِ بے در سے پرے کا بھی ہے ذوق
یہ مِرے بال ، مِرے پَر نہیں جانے دیتے

حدِّ افلاک پہ جا کر تو صدا دے آیا
مگر افلاک سے اُوپر نہیں جانے دیتے

○

جب پاؤں صبا بہرِ تگ و تاز نکالے
یہ شرط ہے اُس پر کہ نہ آواز نکالے

تُو آ تو سہی ، صحنِ گلستاں میں بہر گام
استادہ ہیں سب سرو و سمن ، ساز نکالے

اب بھی کبھی یاد آئے جو وہ سروِ خراماں
دل میں کوئی طائر پرِ پرواز نکالے

وہ بھی ہیں بہت عقل پہ نازاں کہ جنھوں نے
خلقت پہ نئے ظلم کے انداز نکالے

آ پہنچا ہے وہ وقت کہ خورشید سرِ بزم
جو دِل میں چھپا رکھا ہے ، وہ راز نکالے

○

ہمیں رکھتی ہے یوں قیدِ مقام آزردہ
کہ جیسے تیغ کو رکھے نیام آزردہ

ہے جانے کس لئے ماہِ تمام آزردہ
کھڑا ہے دیر سے بالائے بام آزردہ

گریباں چاک کر لیتی ہیں کلیاں سن کر
ہوائے صبح لاتی ہے پیام آزردہ

بتا اے زندگی یہ کون سی منزل ہے
ہے خواب آنکھوں سے اور لب سے کلام آزردہ

یہ خاکِ سُست رَو اس کے ہیں اپنے عنصر
نہ ہو اس سے ہَوائے تیز گام آزردہ

گِری ہے تاک پر شاید چمن میں بجلی
پڑے ہیں سر نِگوں مینا و جام آزردہ

غزل کِس بحر میں خورشیدؔ یہ لکھ ڈالی
نہ کر محفل کو یوں اے کج خرام آزردہ

○

گھر بھی جُھکے جُھکے سے ہیں دَر بھی جُھکے جُھکے
بستی کے ہیں تمام شجر بھی جُھکے جُھکے

سبزے میں ہے خرامِ صبا بھی اُداس اُداس
شاخوں پہ طائروں کے ہیں پَر بھی جُھکے جُھکے

افسردگی سے دستِ طلب میں سکت نہیں
گُل بھی جُھکے جُھکے ہیں ، ثمر بھی جُھکے جُھکے

ایسا زوال ہے کہ بلندی نہیں کہیں
مدّت سے سرکشوں کے ہیں سر بھی جُھکے جُھکے

منظر کی پستیوں سے نگاہیں بھی پست ہیں
محوِ نظر ہیں اہلِ نظر بھی ، جُھکے جُھکے

انگڑائی لے کے وقت کہیں اُٹھ کھڑا نہ ہو
دُکھتی ہے آسماں کی کمر بھی جُھکے جُھکے

پلکیں اُٹھا کہ پھر سے رواں کائنات ہو
تھکنے لگے ہیں شمس و قمر بھی جُھکے جُھکے

○

مجھ سے محروم رہا میرا زمانہ خورشید
مجھ کو دیکھا، نہ کسی نے مجھے جانا خورشید

آنکھ میں تھی کہیں تازہ کہیں فرسودہ نگاہ
زیرِ افلاک، نیا کچھ نہ پرانا خورشید

ڈھونڈنا ہے تو مجھے ڈھونڈ سخن میں میرے
تابِ خورشید حقیقت ہے فسانہ خورشید

ڈوبتی شام یہ کہتی ہے ہلاتے ہوئے ہاتھ
صبح دَم دیر نہ کرنا ، پلٹ آنا خورشید

اُس کے آنسو میں ہے ڈوبے ہوئے تاروں کا ملال
اخترِ صبح سے آنکھیں نہ مِلانا خورشید

راہ میں گوہر و زر ، خوف و خطر ، کچھ بھی سہی
گزر آنا ، گزر آنا ، گزر آنا خورشید

یہ جہانِ گزراں لائقِ اندیشہ نہیں
دِل بھی ٹوٹے تو ذرا دِل نہ دُکھانا خورشید

○

خوفِ زیاں کے واسطے ، خواہشِ سُود کے لئے
کشتیِ جانِ ناتواں ، بحرِ وجود کے لئے

دھوپ کے پاس ایک ہی چادرِ ہفت رنگ ہے
سرخ و سیاہ کے لئے ، سبز و کبود کے لئے

موجِ ہَوا کے سامنے ایک شرر کی کشمکش
بود و نبود کے لئے ، آتش و دُود کے لئے

نام ونمود سب کی ہے منزلِ آخریں فنا
اور مِلی ہے زندگی نام و نمود کے لئے

راحت و رنجِ دہر کے رفت و گزشت سے گزر
خونِ جگر بچا کے رکھ نقشِ خلود کے لئے

لب کہیں ، سامعہ کہیں ، غنچہ کہیں ، صبا کہیں
صورتیں نَو بہ نَو بنیں ، گفت و شنود کے لئے

ہے مرے دِل میں ایک نام اور مرے منہ میں ہے زبان
اُس پہ سلام کے لئے ، اُس پہ درود کے لئے

جانے کیا ہے

جانے کیا ہے موت کیا ہے زندگی
چلتے چلتے کیسے تھم جاتی ہیں تصویریں تمام
خاک ہو جاتی ہے پھر سے مشتِ خاک
گاہے گاہے سنگ ہو جاتے ہیں چہروں کے نقوش
اپنے اپنے زاویے پر منجمد
دم بخود، رہتے ہیں محوِ انتظار

١٠٩
ناتمام

○

تُو نے کبھی سوچا ہے کہ وہ کون ہے جس نے
آواز تجھے ، ذوقِ سماعت مجھے بخشا

پہلے رسن و دار کو رفعت سے نوازا
پھر اُن کے برابر قد و قامت مجھے بخشا

○

زندگی کٹتی چلی جاتی ہے ، اِس کا نہیں رنج
رنج یہ ہے کہ کبھی ڈھنگ سے زندہ نہ رہے

اِسی دورانِ اسیری میں کبھی ہم سے ملو
جانے کب خاک کے پنجرے میں پرندہ نہ رہے

○

اُن پرندوں کو نشیمن سے بھلا کیا لینا
جن کو پرواز کے دوران میں مَر جانا ہے

پھیل جاتی ہے بہر گام مِری حدِّ سفر
سخت مشکل ہے کہ تا حدِّ نظر جانا ہے

○

بھلانا بہت دُور کی بات ہے
کہوں کیا کہ تجھ کو بھلایا نہیں

کہ مَیں نے کبھی چہرۂ غیر سے
نظر کا دِیا تک جلایا نہیں

○

یہ اپنا ذوق ہے اور اپنی اپنی فطرت ہے
جواز تو نہ خوشی کا یہاں نہ غم کا ہے

رمق تو دِل سے گزرتی ہے چارہ جُوئی کی
مگر خیال ترے زخمِ محترم کا ہے

○

دُعا یہ ہے کہ تنو مند ہو شجر میرا
نہ یہ کہ صحنِ گلستاں میں آندھیاں نہ چلیں

شکست کھا کے بھی رفتارِ عاشقاں ہے وہی
عناں گسستہ چلیں اور کشاں کشاں نہ چلیں

○

بھرم اِسی میں تحمّل کا ہے کہ مَر جائیں
جئے تو پھوٹ بہے گا یہ سب کبھی نہ کبھی

نہ میرے بس میں نہ میری سمجھ میں آتا ہے
یہ میرا دِل کہ ہے طوفاں کبھی سفینہ کبھی

○

سوچو تو ہیں فقیر کو آزادیاں بہت
دنیا میں یہ نصیب کہاں بادشاہ کے

جب جی میں آئی مثلِ ہَوا اُٹھ کھڑے ہوئے
جب چاہا ، ساتھ بیٹھ گئے گردِ راہ کے

○

اے گردشِ دہر، اب تو خوش ہو
پابندِ رواج ہو گئے ہم

پھولوں کو تلاش کرتے کرتے
کانٹوں کی رِدا پہ سو گئے ہم

○

زندگی کا یہی ہے رنگ تو پھر
زندگی کو ثبات ہو بھی تو کیا

دل کو ڈوبے ہوئے زمانہ ہوا
اب ترا التفات ہو بھی تو کیا

○

جو شعلۂ تصویر سے جل جائے وہ دامن
جو ابر کو دیکھے سے گُہر دے وہ صدف ہوں

جو درد کِسی سے نہ اُٹھا مَیں نے اُٹھایا
ہر ناوکِ گُم کردہ ہدف کا مَیں ہدف ہوں

○

جیسی شوریدہ سری مجھ میں رہی ہے اِک عمر
ویسی شوریدہ سری جُوئے کُہستاں میں نہ تھی

کِسی ترکش میں کوئی زخم نہ آتے دیکھا
زخم دِل میں تھا، خلش دل میں تھی، پیکاں میں نہ تھی

○

تم کو کیا خبر خامہ کس دھنک سے گزرا ہے
کالی روشنائی سے کالی روشنائی تک

○

ہنگامۂ دنیا کا حاصل ہیں سو دو آنسو
اِک اشکِ محبت ہے، اِک اشکِ ندامت ہے

○

بجا کہ فقر کا مسکن دِلوں میں ہے لیکن
وہ فقر بھی نہ رہا، جب وہ بوریا نہ رہا

○

کِسی کی یاد بھی ہو۔۔۔خلوتیں نہیں کافی
خیالِ غیر کو دِل سے نکالنے کے لئے

○

بہارِ تازہ ہے اپنی مہک کی آپ شہید
لئے ہے پھول ہر اِک شاخ دستِ نازک میں

○

زباں سے مَیں بھی لگایا کِیا بہت پیوند
کِسی طرح مِرے دِل کی شکستگی نہ گئی

○

شعر ہے ہستیٔ موہوم کا اِک عکسِ مزید
مَیں ہوں تصویر کی تصویر بنانے والا

○

ہر ایک چہرے کو دِل سے گزار کر دیکھو
گزر گیا تو ستارہ، ٹھہر گیا تو قمر

○

مَیں زمانے کی نظر میں ہوں عبث گریہ سرشت
کوئی سمجھا ہی نہیں رنجِ فراواں میرا

○

آج کس چہرۂ شاداب کو دیکھا کہ ہمیں
طاقِ نسیاں میں جو رکھے تھے، وہ گُل یاد آئے

○

مسکرانے پہ نہ جا، شرطِ مسرّت یہ ہے
کہ تہِ دِل میں کہیں گوشۂ افسوس نہ ہو

○

گھر بناتے ہوئے سیلاب کا سوچا ہی نہ تھا
اب سرِ بام ہے بنیاد کا ماتم کیا کیا

○

ترتیب جس جہاں کو دیا جاگ جاگ کر
اب آنکھ بند کر کے اسے دیکھنا بھی ہے

○

آج بھی بزم میں ہیں رفتہ و آئندہ کے لوگ
ہر زمانے میں ہیں موجود زمانے سارے

○

دلِ حزیں غمِ فردا میں اس قدر گُم تھا
خوشی گزر گئی اور اِس کو کچھ خبر نہ ہوئی

○

ترے کرم سے قدم کو سہارتی ہے زمیں
مرا غرور سلامت ترے کرم سے ہے

میں عمیق تھا کہ پلا ہوا تھا سکوت میں
یہ جو لوگ محوِ کلام تھے، مجھے کھا گئے

خورشید رضوی جدید غزل گو ہے مگر وہ اپنی جدّت کی نمائش نہیں کرتا۔ اُسے نمائش کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ اس کی جدّت ہئیت کی بجائے موضوع اور الفاظ کی بجائے مفہوم سے رشتہ رکھتی ہے۔ وہ اپنے رویے اور اپنی سوچ کی جدّت کی وجہ سے جدید ہے۔ آخرِ کار، اسی نوعیت کی جدّت سلسلۂ غزل کی ایک ارتقائی کڑی کو مکمل کرے گی اور مستقبل میں آج کے دور کی غزل کی انفرادیت خورشید رضوی کے سے شعراء ہی کی غزلوں سے پہچانی جائے گی۔

بنیادی طور پر خورشید رضوی جذبے کی گہرائیوں اور لطافتوں کا شاعر ہے اور جذبے کی انتہائی باریک پرتوں کو وہ جس بے ساختگی اور سادگی سے اپنی غزل میں چھوتا ہے وہ آج کے دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ آج کل تو جذبے کا قتل ہی نام نہاد جدّت کی پہچان ہے۔ مگر جب جذبہ قتل ہوتا ہے تو شاعری بھی دم توڑ دیتی ہے۔ خورشید رضوی کا جذبہ بھی زندہ ہے اس لیے اُس کی غزل بھی توانا ہے اور اسی لیے اُس کا مستقبل بھی فروزاں ہے۔

احمد ندیم قاسمی